جمادی الاولیٰ و جمادی الثانیہ ۱۳۵۶ھ

جلد (۱۰) عدد (۵)

جلد (۱۱) عدد (۱)

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰

رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صمہ)

قیمت فی پرچہ (عہ)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کردی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت [illegible] جلد ([illegible]) سکہ انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] سکہ انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرستِ مضامین

ماہ جمادی الآخریٰ و رجب ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ عدد ۶ و جلد ۱۱ عدد ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کئی مہینے سے پرچہ کی اشاعت مسلسل تاخیر کے ساتھ ہو رہی تھی۔ ہم نے انتہائی کوشش کی کہ حسب سابق اشاعت اپنے وقت پر آجائے، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس لیے اب مجبوراً جمادی الاخریٰ اور رجب کے پرچے ایک ساتھ نکالے جا رہے ہیں۔ آئندہ سے امید ہے کہ مہینے کا پرچہ ختم ماہ تک ناظرین کو مل جایا کرے گا۔

ترجمان القرآن کے سابق مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے برادران اسلام سے اعانت کی جو درخواست کی گئی تھی، اس کے جواب میں اب تک چار سو روپے حالی اور پچاس روپے کلدار دفتر کو وصول ہوئے ہیں اور مزید پچاس روپے کلدار کا وعدہ ہے۔ جن اصحاب نے ہماری اس درخواست پر توجہ کی ان کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، اور اس خلوص نیت کا اجر عطا فرمائے جس کے ساتھ انہوں نے دنیا کے کسی فائدے کے لیے نہیں، بلکہ محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے انفاق مال کیا ہے۔

اگرچہ یہ رقم اس کام کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم انجام دینا چاہتے ہیں، لیکن خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے کام کی ابتدا کر دی گئی ہے۔ مضامین کی ترتیب اور نظر ثانی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ رمضان سے اشاعت کا آغاز ہو جائیگا۔

رسالہ کی توسیع اشاعت کے لیے بھی ناظرین کو توجہ دلائی گئی تھی۔ اگرچہ اس سے اشاعت میں کوئی

ایسا بڑا اضافہ نہیں ہوا جو رسالہ کی مالی مشکلات کو حل کرنے کے لیے کافی ہو، صرف ساٹھ ستر نئے خریدار مہیا ہوئے لیکن ناظرین رسالہ میں سے متعدد حضرات نے جس خلوص اور ہمدردی کے ساتھ ہماری اپیل پر توجہ کی اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ جو لوگ اس رسالہ کو ملاحظہ فرماتے ہیں ان کی ایک بڑی اکثریت اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد سے دلی ہمدردی رکھتی ہے، فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ جن اصحاب نے توسیع اشاعت کے لیے عملاً کوشش کی، ان کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔ اگرچہ اصل شکریہ تو اللہ ہی ادا کرے گا جس کا کام سمجھ کر انہوں نے اس آواز کو اپنے دوسرے بھائیوں تک پہونچانے میں حصہ لیا

پچھلے مہینہ ایک صاحب خیر مسلمان رئیس نے پچیس روپے عنایت فرمائے تھے تاکہ ان کی طرف سے غریب مسلمانوں کے نام مفت یا رعایتی قیمت پر رسالہ جاری کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک دار المطالعہ کو مفت اور آٹھ اشخاص کو نصف قیمت پر ایک سال کے لیے رسالہ دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے پاس بکثرت درخواستیں ایسے لوگوں کی آ رہی ہیں جو رسالہ پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں لیکن پورا چندہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے جن اصحاب کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اگر وہ اس سلسلہ میں تھوڑی مدد فرمائیں تو ان کے بہت سے غریب بھائیوں کو رسالہ سے استفادہ کا موقع مل سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ خود ادارۂ ترجمان القرآن کی مالی حالت اب کسی رعایت کی متحمل نہیں ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اس کا تعلق کلیۃً صرف اُس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق

ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ محض نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اُن پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے، اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گردوپیش کی ساری دنیا سے، ایک الگ چیز ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں۔ اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو، اس پر پوری زندگی کی عمارت، ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادی علائق سے نفرت، لذات دنیوی سے کراہت، عالم اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا، اس کو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں، اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی سے گندی اور بدتر سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہتا ہے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے، تاکہ ذوق

اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادت گاہوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دنیا میں ہرجگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے۔ سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے، اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر ـــــ جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے ـــــ جس طرح چاہا چلایا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کرلیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا، اس لیے اگر وہ ساتھ رہا تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں، اور ہر قسم کی تمدنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ مُلحق ہوسکتا تھا۔ اس نے ننگی اور رقاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی، سود خواری اور قارونیت کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فطری تصور پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کرکے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھادیں۔ آپ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جزو نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان

میں ہر ہر قدم پر راہ راست اور راہ کج کے درمیان فرق کرکے دکھائے، راہ کج سے بچائے، راہ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں، جو دنیا سے لیکر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی وسعادت کے ساتھ گذار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اسکو بھی پرانے جاہلی تصور کے تحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے۔ یہ جسقدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعے کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں۔ اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں، دونوں ملکر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں۔ اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے، اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

اسلام ایک خاص طریق فکر (Attitude of mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (out look on life) ہے پھر وہ ایک خاص طرز عمل ہے جس کا راستہ اسی طریق فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریق فکر اور طرز عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے، وہی تہذیب اسلامی ہے، اور وہی تمدن اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں

نہیں ہیں بلکہ سب ملکر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریق فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے: انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابتداروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، قوم و ملت کے، ملک و وطن کے ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوع انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر قوت کے کیا حقوق ہیں؟ پھر یہی طریق فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے مقصود متعین کرتا ہے، اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو، خواہ وہ کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔ یہ مقصد ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے جو شے مقصد کے حصول میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے، اور جو شے سدّ راہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، طہارت میں، صنفی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ مرکز مقصود کی طرف جانے والی .... سیدھی راہ پر قائم رہے، اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزل مقصود کی طرف جانے والے ہوں، اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لیے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے

استعمال کرے تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اسکی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں، اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراک اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اُس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصلِ فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروان اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطہ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کارزار تک، طریق عبادت سے لیکر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لیکر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثارِ فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبیعی کی بلند ترین تحقیقات تک زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس لیے جوڑا گیا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا، اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے، مگر آج بھی اُتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرہ آفاق یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے اَن پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور ورا ثت میں

منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے "تاریک" حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دینداری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال"۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے اور تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقام حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگان نورِ علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم اپنے قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

فہم و ادراک کے اس قصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے، بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے، اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر مسلمان۔ اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام اور پھر پنجابی، بنگالی، کوکنی، اور مدراسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے، زندگی کا ایک جداگانہ نقطۂ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے، ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں، اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے، اس لیے کہ اسلام ایک "مذہبی ضمیمہ" ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیے۔ دین کا تعلق

ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں یعنی اعتقادات اور عبادات، اس کی حد تک مسلمان اپنی الگ راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات، تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں، جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ انکو انجام دیتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہیے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے لیے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک مشترک نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہیے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے اٹھے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان و اذعان، اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبیعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں، اس لیے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں وہی ان کے نزدیک اصلی اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عمل کی تہ میں کام کرتا ہے اور جو اپنے طریق فکر و زاویہ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راستہ اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمنی، یا اطالوی یا فاروقی و خالدی، ان کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی ذہن" ہیں کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور تمکن فی الارض۔ جس کو زمین کی وراثت "حاصل ہے وہ "صالح" ہے اگرچہ وہ ابراہیم کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب و بالادست ہے وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ مسیح کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا ہی کیوں نہ ہو!

ایک بڑا گروہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کیلئے اٹھا ہے اس کے نزدیک اسلام اور اسکی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ ان کے "مسلم پرسنل لا" کی حفاظت کا اطمینان دلا دیا جائے، انکی ... ان کو

اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو صرف انہی کو
مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی ان کے نزدیک
سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ ہوگا
جب تک خود مسلمان نمائندوں کی غالب اکثریت اس کو قبول نہ کرے تو ان کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا

دیکھا آپ نے! شکلیں کس قدر مختلف ہیں مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں اُسی جاہلی
تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے
تو ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمۂ طیبہ کا زبانی
اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو۔ لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے اُس کی حیثیت اس سے زیادہ
کچھ نہیں کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہے، ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد
اقرار اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے
کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ تمہارا طریق فکر وہی ہو جو قرآن کا
ہے زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو جو قرآن کی نظر ہے تم اشیاء کی قدریں (values)
اسی معیار کے مطابق معین کرو جو قرآن نے اختیار کیا ہے، تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو جو قرآن نے
پیش کیا ہے، اور تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی بنا پر
انتخاب کرو جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔ اگر تمہارے ذہن کو یہ چیز اپیل نہیں کرتی، اور
تمہارے نفسیات قرآنی نفسیات کے سانچے میں ڈھلنا قبول نہیں کرتے، تو کوئی تم کو دائرۂ اسلام میں آنے یا رہنے پر
مجبور نہیں کرتا۔ عقل اور راست بازی کا اقتضا، یہ ہے کہ تم کو اس دائرے کے باہر اپنے لیے مناسب جگہ تلاش
کرنی چاہیے۔ لیکن اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد

کر لیتے ہو، تو پھر زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اُس راستہ سے الگ نہیں ہوسکتا جسے قرآن سبیل المومنین کہتا ہے۔ اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن ــ کہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں ــ جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے، چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعائر" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے، ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں پہننے کے سامان میں لباس کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بند و بست میں سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں، مادّی وسائل اور قوانین طبیعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے، طریق فکر ایک ہے، نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے، اس لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہوسکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصولوں کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہوسکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کرسکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے۔ جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی۔ آپ خواہ ہندوستانی ہوں یا ترکی یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی اور ہر اس اسکیم کو رد کر دینا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔ یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے اور دوسرا مرحلہ نتائج کا۔ آپ زندگی کے پہلے مرحلہ میں دنیا کو جس طرح برتیں گے، دوسرے مرحلہ میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے۔ اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو

صحیح طریقہ سے برتیں جس سے دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں۔ پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے، اور اس میں اعتقادات و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اس اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ الگ پارٹیوں میں منقسم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہی پارٹی —— حزب اللہ —— ان سب کاموں کے لیے کافی ہے، کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراک عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں۔ کیوں نہ آپ ان اصولوں کے مطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں، وہ اگر مجبوراً تنازع طبقات (Class War) کی آگ میں کود تے ہیں تو آپ کیوں ان کے پیچھے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں، علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے اور ایک وہ تھا جو صحابہ کرام اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں، اور دونوں تسخیر عناصر، استعمال اسباب اور قوانین طبیعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں، مگر زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بُعد —— بعد المشرقین —— ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن، اُس تسخیر عناصر اور استعمال اسباب کا نتیجہ ہے جس کی تہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے، وہ بھی

اگرچہ تسخیرِ عناصر اور استعمالِ اسباب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، مگر اس کی تہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقادِ یومِ آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو، اور جب تک کہ زندگی کی ساری جد و جہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے ۔۔۔ وہی "ارکانِ اسلام" جن کو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی حقوق کو سمجھنے اور ان کے تحفظ کے صحیح طریقے معلوم کرنے میں جو غلطی کی جا رہی ہے، اس کی تہ میں بھی وہی جہل کار فرما ہے جس کے مظاہر آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی پوری سکیم اگر غیر اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے تو جس چیز کو آپ "مذہب" کہتے ہیں، اور جسے "پرسنل لا" قرار دیتے ہیں اس کا اپنی اصل پر باقی رہ جانا، اور آپ کی زبان کا اپنے رسم الخط کے ساتھ محفوظ رہنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا، اس لیے کہ اس غیر اسلامی مجموعہ میں یہ بے جوڑ اسلامی اجزاء کسی طرح کھپ نہ سکیں گے اور رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑتے چلے جائیں گے۔ پھر ان اجزاء کی حفاظت جن نمائندوں کے ہاتھ میں آپ دینا چاہتے ہیں وہ اگر محض اصطلاحی و قانونی مسلمان ہوں تو وہ ان کی حفاظت بس اتنی ہی کر سکیں گے جتنی غیر مسلم کر سکتے ہیں۔ ایسے مسلمان اگر اسلامی اصولوں کے خلاف ۹۹ نہیں ۹۹ کی اکثریت سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ اسلامی جماعت کے لیے اتنا ہی نقصان دہ ہوگا جتنا غیر مسلموں کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

دراصل ہمارے قومی مسائل وہ ہیں ہی نہیں جن کو حل کرنے کی آج کل کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے جسے سمجھانے کے لیے ہم کئی مہینے سے دماغ سوزی کر رہے ہیں، مگر افسوس کہ اس ہنگامۂ قیل و قال میں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔

مقالات

مسلمان اور امامت کبریٰ

(۳)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

پچھلی صحبت میں صحیح بخاری کی یہ حدیث نقل کی گئی تھی کہ:۔

لتتبعن سنن من کان قبلکم حذو النعل بالنعل حتی لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ قالوا الیھود والنصاریٰ؟ قال فمن؟

قسم ہے اللہ کی تم پچھلی قوموں کے راستوں پر چلکر قدم بقدم ان کی پیروی کروگے یہانتک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں گھسی ہوں گی تو تم بھی اس میں داخل ہو کر رہو گے لوگوں نے پوچھا کیا ہم یہود و نصاریٰ کی پیروی کریں گے؟ فرمایا پھر اور کون!

اسے عالم الغیب کا ملہمانہ فیضان کہیئے یا فطرت کی نبض شناسی کا پیغمبرانہ کمال کہ اس نے انسانی طبیعت کے اتار چڑھاؤ اور قوموں اور جماعتوں کے ظاہر و باطن پر مرور زمانہ کے اثرات کا گہرا احساس کرکے جو حکم اس امت سے لیے لگایا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوکر رہا۔ اقوام ضالہ کی داستان مغضوبیت اس کے سامنے تھی اس مغضوبیت کے اسباب ایک ایک کرکے اسے یاد تھے نیز اس کی حکیمانہ اور دوررس نگاہوں کو انسان ظلوم و جہول کی ساری فطری کمزوریاں نظر آرہی تھیں جو ان اسباب کو پیدا کرتی اور پروان چڑھاتی ہیں۔ آدمی کے اندر دو ہی قسم کی قوتیں ہیں، قوائے علمی اور قوائے عملی۔ اس لیے فطرت کی شاہ راہ سے [illegible] بھی دو شکلوں میں نمودار ہوا ہے علمی خرابیوں اور کج رویوں نے نصاریٰ کی [illegible] ڈبوئی اور عملی [illegible] یہود کو لے ڈوبیں۔ صحیفۂ فطرت کے ان ناقابل فراموش حقائق کو پڑھکر اور یہ دیکھکر کہ زمانہ نبوت کے برکات ختم ہوتے ہی دنیا کے

فتنے ہدایت الٰہی پر کس طرح غائب ہوجاتے ہیں، رسول عربی فداہ ابی و امی نے مسلمانوں کے آیندہ حالات کے متعلق جن خطرات کا اظہار کیا، کیا وہ عین حقیقت کی ترجمانی اور فطرت انسانی کی نبض شناسی نہ تھی؟ اہل کتاب کا وہ کونسا طرز عمل ہے جس کے اتباع میں مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا رکھی ہو؟ اُن کا کونسا نقش قدم ہے جس پر انہوں نے ٹھیک ٹھیک ناپ تول کر اپنے قدم نہ رکھے ہوں؟ ان کی علمی و عملی ضلالتوں کا کونسا شوشہ ہے جس سے ان کا نامۂ اعمال ابھی سیاہ نہیں ہوا ہے؟ قرآن حکیم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اعتقاد و عمل کی گوناگوں خرابیوں اور ان کے اسباب و نتائج کو ایک ایک کرکے بیان کیا ہے۔ ایک تفصیلی نظر اس بیان پر ڈالیے اور اس کے بعد لتتبعن سنن من قبلکم کی صداقت پر غور کیجیے۔

اہل کتاب کے جرائم

ملی افتراق شریعت الٰہی دنیا والوں کے لیے رحمت بن کے آتی ہے۔ اس کا مقصد امن و سلامتی کی زمین پر سعادت کے علم کو نصب کرنا اور ساری مخلوق الٰہی کو اختلاف و تشتت کے خارزار سے نکال کر وحدت اور مودت کے شیرازے میں منسلک کرنا ہوتا ہے۔ انسانی طبائع کو جن کی خواہشیں ایک دوسرے سے بالکل جدا گانہ اور بے جوڑ ہوتی ہیں کوئی چیز ایک نقطہ پر جمع نہیں کرسکتی۔ اور جب تمام افراد کا طبعی رجحان ایک نہ ہو دین و آخرت کی کسی کامیابی سے قوم ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ شریعت الٰہی اختلافات اور اہوا و آراء کے ہلاکت آفریں مفاسد کا قلع قمع کرکے سب کے سامنے ایک بلند نصب العین اور پاکیزہ قانون حیات پیش کرتی ہے جب کسی قوم کے بھلے دن آتے ہیں، تو وہ اس مرکز پر جمع ہوجاتی ہے اور یہ شریعت یا اس کی پاک اور بلند تعلیم اس جسم کی روح ہوتی ہے لیکن جب امت کا ستارۂ اقبال گردش میں آجاتا ہے اور وہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر خواہشات نفس کے اتباع کی طرف رجوع کرنے لگتی ہے تو اس روح وحدت میں اضمحلال پیدا ہوجاتا ہے اور پھر وہ وقت آجاتا ہے کہ قوم اپنی شقاوت کی تمام سیڑھیاں طے کرکے سنت الٰہیہ کو مجبور کردیتی ہے کہ اس روح کو نکال لے اور قوم کے اس کھوکھلے پیکر کو آسمان کی لعنتیں سہنے اور حوادث روزگار کے تھپیڑے کھانے کے لیے افتادہ چھوڑ دے۔ اس وقت وہ شریعت جو

پوری امت کے رگ و ریشے میں وحدت کا خمار پیدا کرنے آئی تھی خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور اس کے پیرو جن کا خدا اور معبود ایک ہوتا ہے جن کا پیغمبر اور ہادی ایک ہوتا ہے جن کی کتاب اور شریعت ایک ہوتی ہے خود شریعت ہی کے نام پر مختلف راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ کسی قوم کی انتہائی پستی اور بدبختی کی معراج ہے اہل کتاب کے صحیفۂ زندگی کا سب سے بدتر اور سیاہ ترین داغ یہی ہے۔

مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی تھی کہ دیکھو یہ تمہارے پیشروؤں کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہے اس سے ہمیشہ دور رہنا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (انعام ۲۰) — جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

ایک اور دوسرے مقام پر ان تفرقہ پردازوں اور وحدت دینی کے چشمۂ صافی کو اختلاف و تفرق کی کثافتوں سے مکدر کرنے والوں سے تبری کا حکم دیتے ہوئے قرآن حکیم نے اس حقیقت کو اور زیادہ بے نقاب کر دیا ہے کہ فرقہ بندی ضلالت کا گہوارہ، اہواء کی پرستش اور فرمان الٰہی سے عدوان اور کھلی ہوئی بغاوت ہے

.... وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (روم - ۴) — اور اے مسلمانو تم مشرکین کی راہ مت چلنا جو اپنے دین میں تفریق پیدا کر کے گروہ گروہ بن گئے اور حال یہ ہے کہ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ فریفتہ ہے۔

دیکھا آپ نے شرک اور تفریق دین کی سرحدیں کس قدر ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں؟ قرآنی اسلوب بیان کیا اشارہ کر رہا ہے؟ انہی خوفناک خطرات سے بچانے کے لیے قرآن نے بار بار مسلمانوں کو ایک صراط مستقیم پر چلنے اور حبل اللہ کو ہاتھ سے تھامے رہنے کی دعوت دی تھی وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۔

قرآن کی نگاہ میں تو قوم کا معمولی اور غیر ملی اختلاف بھی قوم کی ساکھ مٹا دینے کے لیے کافی ہے۔

تحریف کتاب اہل کتاب کا دوسرا سب سے بڑا جرم کتاب الٰہی میں ان کی لفظی اور معنوی تحریف ہے۔ ان کی نفسانی خواہشات ان کے لیے ایک مقدس قربان گاہ ہوتی تھیں جن پر کتاب الٰہی کی آیات نہایت آسانی اور بے دردی کے ساتھ قربان کر دی جاتی تھیں۔ مادی رغائب پر حکم خداوندی متغیر ہو سکتا تھا، زخارف دنیوی کے بدلے آیات قرآنی فروخت کی جاسکتی تھیں، ضرورت پیش آنے پر عبارتوں کو الٹا پلٹا جاسکتا تھا، الفاظ کے بالکل اچھوتے معانی بیان کیے جاسکتے تھے، صاف اور سلیس فقروں کی غلط لیکن ضرورت کے مطابق تاویلیں کی جاسکتی تھیں۔ غرض کتاب کیا تھی، علماء کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھا کہ اس سے جس طرح چاہتے تھے کھیلتے تھے۔

قرآن مجید میں علماء یہود کے کارناموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ الآیۃ۔ (بقرہ ۶۵)

پس ظالموں نے خدا کا وہ قول بدل ڈالا جو ان سے کہا گیا تھا۔

دوسری جگہ اور کھول کر ان کی اس شرارت کا حال بیان ہوا ہے:۔

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا، فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ۔ (بقرہ ع ۹)

پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب (توراۃ) اپنے ہاتھوں سے اپنی طرف سے گھڑ کر لکھتے ہیں پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے (ایسا کرتے ہیں) تاکہ اس کے بدلے تھوڑا مال خریدیں پس افسوس ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور خرابی ہے ان کے لیے کہ وہ ایسی کمائی کرتے تھے۔

اس طرح کئی مقام پر یہود کی اس ناپاک حرکت کا ذکر آیا ہے کہ وہ الفاظ اور عبارات میں تحریف کیا کرتے تھے يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ۔ اس تحریف کے جادو سے وہ دین دنیا دونوں کو اپنا بنانا چاہتے تھے اور فسق و فجور کی ان تمام لعنتوں کے باوجود اپنی محبوبیت کے غرہ میں فردوس کو اپنا حق ملکیت سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمارے ہوتے کون اس کا حق دار ہے؟ ہاں ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگوں کو گوسالہ پرستی

کے جرم میں دو چار روز کی سزا ہو جائے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۔ (آل عمران ۳)

یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے (یعنی ان کا اعتقاد تھا) کہ ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند روز تک اور اپنے دین کے بارے میں انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا اس چیز نے جو وہ گڑھتے تھے (کتاب میں)

اسی طرح نصاریٰ کے متعلق بھی فرماتا ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (مائدہ ۳)

اور ان لوگوں سے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ہم نے میثاق لیا تھا لیکن انہوں نے بھلا دیا ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ انھیں تذکیر کی گئی تھی (یعنی کتاب الٰہی)۔

کتمان حق تحریف کے علاوہ جو کچھ تعلیمات اپنے اصلی رنگ و روپ میں موجود رہ گئی تھیں وہ بھی ان کو ربانیوں کی مصلحت پرستیوں کی بدولت منظر عام پر نہ آسکتی تھیں سورج سے زیادہ صاف اور واضح حق کو نگل جانے میں انھیں باک نہ ہوتا۔ ان کے نزدیک حق و باطل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ ہر ایک دوسرے کی جگہ نہایت آسانی سے لے سکتا تھا۔ دل اعتراف حق کے اضطراری جذبات سے مملو ہوتا لیکن زبان اپنی لن ترانیوں کے شور سے باز نہ آتی انھیں بار بار اس شیطانی نفاق پر متنبہ کیا جاتا تھا کہ

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (بقرہ ۵)

حق و باطل کو گڈمڈ مت کرو نہ حق کو چھپاؤ دراں حالیکہ تم جانتے ہو۔

نبی موعود کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن صرف اس حسد کی بنا پر کہ مسیح کی بشارت کا ظہور بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسمٰعیل میں کیوں ہوا، بیک جنبش لب میثاق الٰہی کی دھجیاں اڑا کر رکھدیں، اور بجائے اس کے کہ اپنی کتاب کی بے شمار پیشین گوئیوں کے مطابق اس رہبر کامل اور ہادی کونین کی دعوت پر سب سے

پہلے لبیک کہتے انہوں نے تکذیب میں سب پر سبقت کی اور پھر حق کو مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ چھوڑا

قرآن حکیم نے ان کی اس باطل پرستی اور علانیہ حق پوشی پر فرمایا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ الآیۃ (بقرہ ۵) اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو تم پر ہم نے آتاری ہے دراں حالیکہ وہ اس کے مطابق ہے جو تمہارے پاس ہے (توراۃ) اور سب سے پہلے تمہیں اس کا انکار نہ کرو (جبکہ سب سے پہلے تمہیں کو اس پر ایمان لانا چاہیے تھا)۔

انہوں نے صرف اسی زبانی تکذیب پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی کتاب کی پیشین گوئیوں کو جو رسول عربی کے متعلق تھیں یا تو سرے سے نکال ہی ڈالا یا تحریف کا رنگ دے کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ ان کی ساری کوششیں اس بات میں صرف ہونے لگیں کہ کسی طرح سے بھی توراۃ کا کوئی شوشہ پیغمبر عرب کی تصدیق نہ کر سکے۔ اسی وجہ سے اگر ان کا کوئی فرد توراۃ کی ایسی آیتیں مسلمانوں کے سامنے پڑھتا جس سے پیغمبر اسلام کی صداقت ثابت ہوتی تھی تو وہ اس کو بری طرح کوستے اور کہتے کہ تم مسلمانوں کو ایسی باتیں کیوں بتا دیتے ہو جو خود ہمارے مقابلہ میں دلیل بن جاتی ہیں۔ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ (بقرہ : ۹)۔

خاتم الانبیاء کی تکذیب کا وہ اتنا زبردست اہتمام کرتے تھے لیکن خود ان کے قلوب کیا پکار رہے تھے؟

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ الآیۃ (انعام ۲) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی وہ اس قرآن (یا رسول) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے پہچانتے ہیں۔

یہ تو قومی اور نسلی حسد کی کارفرمائیاں تھیں کہ آفتاب حق کو چمکتا دیکھتے اور اس پر خاک جھونکنے کی کوشش کرتے دوسری طرف متاع دنیوی کی محبت بھی ان کی شقی روحوں میں بری طرح پیوست ہو چکی تھی۔ صداقت کی غیر معمولی کشش دلوں کو کھینچے تو لیتی تھی پر جب وہ دیکھتے کہ اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کرنا گویا اہوائے نفس

کی قربانی دینا اور آرام و سکون سے ہاتھ دھونا اور سارے عرب و عجم کے خلاف لڑائی مول لینا ہے تو حق کی روشنی چمک کر بجھ جاتی نتیجہ یہ ہوتا کہ چند روزہ راحت کے بدلہ ابدی ذلت اور مصیبت خرید لیتے ان کی اسی تجارت کی طرف اشارہ ہے :-

اُولٰئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ (سورۃ البقرۃ ۲)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ خریدا ہے لیکن نہ تو ان کی یہ تجارت ہی کچھ نفع بخش ہوئی اور نہ یہ لوگ ٹھیک راہ پر رہے۔

ان کے اس تذبذب یعنی اعتراف حق اور حب باطل کی مثال ایسی ہی تھی جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو آسمان سے زمین تک تاریکی مسلط ہو بجلی کڑک چمک رہی ہو اس طوفان کے اندر کوئی شخص کبھی تو روشنی دیکھ کر آگے قدم اٹھاتا ہو کبھی ظلمت شب سے مجبور ہو کر کھڑا ہو جاتا ہو کبھی بجلی کی کڑک سے کانوں میں انگلیاں ٹھوس لیتا ہو۔ اسی طرح آسمان شریعت سے جب رحمت محمدیہ کی بارش ہوئی جس کے ساتھ وعدہ بھی تھا وعید بھی تھی، نفس کی ظلمت بھی تھی فطرت کا نور بھی تھا، دنیا کی شکل بھی تھی آخرت کی تصویر بھی تھی تو ان یہودیوں کا باطن ایسی ہی متضاد کیفیات اور تفکرات کی کشمکشوں میں مبتلا تھا۔ کبھی فطری اضطرار کی وجہ سے آگے لپکتے کبھی حب الدنیا اور کراہت موت دامن پکڑ کر پیچھے کھینچ لیتی۔ خدا نے انھیں سمجھایا کہ حق کو اتنے سستے داموں نہ بیچو، ڈرنا ہو تو مجھ سے ڈرو، دنیا کے کمزور انسانوں سے کیوں مرعوب ہوئے جاتے ہو۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۫ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ۔

حب عاجلہ اور کراہیت موت | موت کا خوف اور دنیا کی محبت ساری بربادیوں اور ذلتوں کا گہوارہ ہے ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم کثرت آبادی اور فراوانی اسباب کے باوجود دشمنوں کا لقمہ تر بن جاؤ گے۔ صحابہ رضؓ نے فرط حیرت سے بخود ہو کر پوچھا وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا تم میں

وہن پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے پوچھا، وَمَا الوھن ؟ وہن کیا چیز ہے آپ نے تبلایا حب الدنیا وکراھیۃ الموت (دنیا کی محبت اور موت سے فرار) چنانچہ یہود کی یہ سب سے بڑی نمایاں خصوصیت تھی جس نے ان کو ہر طرح ذلیل و خوار کیا، انکی کتاب حیات کے سرورق ہی پر نہایت موٹے موٹے خطوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جب ان کے پیغمبر نے حیات ابدی کی انھیں راہ تبلائی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے میدان جہاد میں اترنے کے لیے کہا تو انھوں نے نہایت صفائی سے کہدیا جاو تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں ہم یہاں بیٹھ کر نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں۔ ان کے نبی نے کہا کہ ارض مقدسہ پر قبضہ کرلو۔ خدا نے اس زمین کا تم سے وعدہ کیا ہے انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو وہاں ہرگز نہ جائیں گے۔ وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں۔ اس قسم کی بزدلی کے واقعات سے ان کی تاریخ لبریز ہے۔

جب وادی مکہ سے آفتاب ہدایت کا ظہور ہوا تو یہی زندگی کی محبت ان کی آنکھوں کا حجاب بن گئی۔ دنیا کا حسن و جمال ان کی آنکھوں میں کھب چکا تھا۔ وہ اس پر مفتون تھے اور کسی بڑی سے بڑی قیمت کے عوض بھی اپنی اس متاع گراں کو بیچنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے دل اقرار کر رہے تھے کہ اسلام حق و صداقت کا پیکر اور آسمانی بادشاہت کے قیام کا داعی ہے لیکن صرف یہ چیز انہیں اسلام قبول کرنے سے روک رہی تھی کہ دین ان سے قربانیوں، جان اور مال اور لذات دنیوی سب کی قربانیوں کا طالب تھا۔ وہ حق کو حق جاننے کے باوجود حب جاہ و مال اور عشق دنیا سے مجبور تھے۔ پھر جب ان کا راس المال ہی خطرہ میں پھنس جاتا تو ان کا حزم و تدبر انھیں ایسی بازی لگانے ہی کیوں دیتا۔

یہ ان کے شیطانی وسوسے تھے جو ان کے بدن کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح سرایت کیے ہوئے تھے چنانچہ قرآن نے ان کا راز کھولا۔

فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ	پس تم دیکھو گے ان کو جن کے دلوں میں مرض ہے کہ اس
فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ	میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں یہاں

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (مائدہ ۸)

لانے سے مصائب میں گھر جانے کا خوف ہے۔ پس قریب ہے کہ خدا فتح نازل کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات۔ اس وقت وہ اپنے اُن وساوس پر نادم ہوں گے جنہیں دل میں چھپاتے ہیں۔

گویا وہ حق سے روگردانی کو اس وجہ سے جائز سمجھتے بلکہ اس پر مصر تھے کہ اس کی راہ مظلومیت اور بے کسی کے کانٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ آخر نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ کے عذرات اِنَّ "اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" کی زبانوں سے کیوں نکلتے تھے؟ اس لیے کہ ان کی نظر میں اس خاکدان عالم کے حدود سے ماوراء جاتی ہی نہ تھیں۔ حیات دنیوی کی آسائشیں ان کو محبوب تھیں اور ان سے دست بردار ہونا ان کے حیطۂ امکان سے باہر تھا۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ۔ (بقرہ ۱۱)

ان یہودیوں کو تم دنیا کی زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔

اور اس لیے کہ اسلام کی راہ پھولوں کی سیج نہ تھی یہاں تو پہلے ہی قدم پر دنیا سے منہ موڑ کر موت کو اہل دل کی عین زندگی اور چشمۂ حیات کا گھاٹ ہے دو ڈکر بلانا پڑتا تھا۔ اور وہ اس سے اتنی ہی تیزی کے ساتھ بھاگتے تھے۔ ذیل کی آیت انھیں معاندین حق اور ظالمین فطرت کو مخاطب کر رہی ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ الآیۃ (جمعہ ۱)

کہدو کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تمہیں پاکر رہے گی۔

گویا ذلت کی موت مرنا اور یوم آخرت کی رسوائیوں کو قبول کرنا آسان تھا لیکن حیات ابدی کے چاؤ میں آگے بڑھنا اور رضائے الٰہی کی طرف قدم اٹھانا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۔۔۔۔۔۔۔۔

علماء سوء حدیثوں میں ہے کہ جب کسی امت کے بُرے دن آتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے علماء اور امراء گمراہ اور بدچلن ہو جاتے ہیں پیشوایان ملت امت کا شیرازہ اور حیات قومی کا قوام ہوتے ہیں۔ سو کتنی بڑی بدبختی اور ہلاکی ہے اس قوم کے لیے جس کا شیرازۂ زندگی ہی نفسانیت کے ہاتھوں تار تار ہو چکا ہو۔ اور کس قدر باعث عبرت ہے وہ امت جس کا قوام ملی ہی فاسد اور زہریلا ہو چکا ہو۔

اسرائیلی امت کے احبار اور رہبان کا کیا حال تھا؟ اور یہ امت انھیں کیا سمجھے بیٹھی تھی؟ یہ احبار ورہبان ورثۃ الانبیاء اور شہداء للناس نہ تھے بلکہ خود پیغمبر تھے بلکہ ایک گونہ خدا بن بیٹھے تھے۔ شریعت ان کی زبان وقلم کی پیرو تھی، اشیاء کی حلت وحرمت ان کی آراء ومصالح کی تابع تھی، چاندی سونے کے سکوں پر وہ سماوی فرامین بدل دے سکتے تھے، یعنی وہ شریعت کے تابع نہ تھے بلکہ شریعت خود ان کی تابع تھی اور انھیں کتاب میں نسخ وترمیم اور حذف واضافہ کے حقوق گویا من جانب اللہ حاصل تھے۔ امت انھیں دنیا اور آخرت ہر لحاظ سے مختار کامل سمجھکر انھیں کو پوجتی تھی۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے احبار اور رہبان کو معبود بنا لیا۔

اس آیۂ کریمہ کے بارے میں صحابۂ کرام نے آنحضرت صلعم سے استفسار کیا کہ انھوں نے اپنے علماء کو خدا کب بنایا تھا؟ آپ نے فرمایا۔ جس چیز کو وہ حلال کہدیتے اسے حلال سمجھ لیتے اور جس چیز کو حرام کہتے اسے وہ حرام سمجھ لیتے، احکام الٰہی کی انھیں کوئی پروا نہ ہوتی۔

یہ علماء سوء اپنے فرائض کلیتہً فراموش کر بیٹھے تھے، انھیں اپنے نفس کی پوجا سے فرصت ہی نہ ملتی تھی، دنیا کے یہ پرستار تھے اور امت انکی پرستار، روح شریعت ان کے ہاتھوں بری طرح مجروح ہو چکی تھی۔ تحریف کتاب اور کتمان حق کی مختصر داستان تو آپ اوپر کی سطروں میں پڑھ چکے ہیں بعض فرائض جو اس گروہ سجادہ نشینان رسول کا خاص مشن ہوتے ہیں ان کے بارے میں بھی اس جماعت کا رویہ ابلیس کے

طرزِ عمل سے کچھ مختلف نہ تھا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے اعراض

علماء اور مشائخ کا سب سے اہم فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے مگر اس کے بارے میں یہود کے احبار و رہبان نے جو تفریط برتی اظہر من الشمس ہے۔ ہر امت بجائے خود سچائی کی گواہ ہوتی ہے، شریعت کی روشن شمع اس کے ہاتھوں میں اسی لیے دی جاتی ہے کہ عالم فطرت کے کسی گوشہ میں تاریکی کا نام و نشان باقی نہ رہ جائے۔ ساری دنیا امن کا گہوارہ اور عدل و قسط کی میزان بن جائے، اللہ کی زمین باطل کے شر سے پاک اور نیکی کے خوش آیند پھولوں سے رشکِ فردوس اور پر بہار بن جائے۔ علماء امت اور خواص کا مقام اس مقصد عظیم کے حصول میں نہایت بلند ہوتا ہے۔ ان کے تارِ نفس کی ہر صدا کو صداقت کا نغمہ ہونا چاہیے۔ وہ لوگوں کے لیے اسوہ ہوتے ہیں، انبیاء کے جانشین اور دین و شریعت کے امین ہوتے ہیں، اس لیے امر بالمعروف کی ذمہ داری ان کے بدن کے روئیں روئیں پر ہوتی ہے اور وہ اس فرض سے ہرگز سبکدوش نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ان کے جسم کے ایک ایک رونگٹے سے اتباعِ شریعت کی روح نہ ٹپکنے لگے، ان کا باطن جمال حقیقت کا آئینہ نہ ہو، ان کی آنکھوں میں مشکوٰۃ نبوت کا پرتو نہ ہو، ان کی پیشانی بجائے خود مصحف الٰہی نہ ہو، وہ حق کے مبلغ ہوں لیکن سراپا حق بن کر، تذکیر ان کا شیوہ ہو لیکن مجسم عمل بن کر، ورنہ کھوکھلے سینوں کی نکلی ہوئی صدائیں فضائے بسیط میں گم ہو کر رہ جائیں گی، وہ دنیا کے اندر کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکیں۔ ایسے علما جن کا باطن عمل کے جوہر سے خالی ہو قدرت کے نزدیک لعنت کے مستحق اور قوم کے لیے عذاب اور تباہی کا پیغام ہوا کرتے ہیں۔ علماء یہود پر جب شقاوت کا عفریت مسلط ہو گیا تو وہ اس فرض کی ادائگی سے علانیہ دست کش ہو گئے، معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا ہوا دیکھتے مگر اس کے خلاف ایک آواز بھی نہ اٹھاتے۔ قرآن حکیم نے ان احبار کو نہایت حقارت آمیز لہجہ میں توبیخ کی ہے۔

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ علماء اور احبار نے انھیں گناہ کی باتیں کہنے اور

عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (المائدہ - ۹)

اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہیں روکا؟ بہت برا ہے جو وہ کرتے تھے۔

لیکن ان کی داستان اسی پر ختم نہیں ہو جاتی کہ انہوں نے لوگوں کو برائی سے روکنا ہی چھوڑ رکھا تھا بلکہ وہ خود اپنے نفس کو بھول بیٹھے تھے اگر کبھی حق پرستی کا ولولہ جوش میں بھی آتا تو غیروں ہی کے لیے۔ خود اس قید و بند سے آزاد تھے۔

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (بقرہ ۵)

کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو درانحالیکہ تم کتاب پڑھتے ہو کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے۔

جب ارباب علم و دانش اور خواص امت کا یہ حال ہو جائے تو تا بدیگراں چہ رسد جب مرکز نصح اور سرچشمۂ خیر ہی مفاسد کا ملجا اور پشت پناہ بن جائے تو پھر قوم سکرات موت کا کب تک مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ معصیت افراد کی معصیت نہیں بلکہ قوم و ملت کے لیے لعنت ہے اسی بنا پر حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایسے علماء قیامت کے دن سب سے پہلے جہنم میں داخل ہونے والوں میں سے ہیں جن کا قول کچھ رہا ہو اور عمل کچھ۔

احکام شرعی سے بے اعتنائی تحریف کتاب اور کتمان حق کے ابواب میں بالاختصار یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ احکام الٰہی کا بیشتر حصہ علمائے دنیا پرست کی ہوسناکیوں اور مصلحت پرستیوں کی نذر ہو چکا تھا اور وہ مقدس قوانین جو دنیا کو مظالم کے شر سے پاک کرنے، پہنائے عالم پر میزان عدل و قسط قائم کرنے اور انسانی قلوب میں حق و سعادت کی تخم ریزی کرنے کے لیے خدائے احکم الحاکمین کی طرف سے کہ مرکز فہم و تدبر اور سرچشمۂ خیر و انصاف ہے نازل ہوئے تھے ان شقی اور بدکیش رہنماؤں کی بدولت کہ ورثۃ الانبیاء تھے خود نگاہوں سے مستور ہو گئے اور صد افسوس کہ فلاح و نجات کا صافی چشمۂ حیوان ان دجاجلۂ امت کی نفسانی کثافتوں سے

مکدر ہو کر دنیا اور دنیا والوں کے لیے پیام حیات کے بجائے دعوت مرگ اور بنائے ظلم و فساد بن گیا اعتقادات سے لے کر اخلاقیات معاملات اور سیاسیات تک، یعنی دینی و دنیوی معاملات کے ایک ایک شعبہ میں احکام الٰہی کے بجائے احکام طاغوت کا تخت بچھا ہوا تھا۔ جو دو چار شرعی قوانین ان کی دست برد سے محفوظ اور اپنے اصلی رنگ و روپ میں باقی رہ گئے تھے وہ بھی ناآشنائے عمل تھے صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے ایک یہودی کو دیکھا جسے ارتکاب فاحشہ کی پاداش میں منہ سیاہ کر کے کوڑے لگائے جارہے تھے آپ نے یہودیوں سے پوچھا کیا توراۃ میں زنا کی حد یہی ہے؟ سبھوں نے جواب دیا ہاں۔ پھر آپ نے ایک یہودی عالم کو خدا کا واسطہ دیکر دریافت فرمایا تو اس نے کہا اگر آپ خدا کو گواہ ٹھہرا کر نہ پوچھتے تو میں ہرگز نہ بتاتا لیکن اب تو کہنا ہی پڑا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے رؤساء اور اشراف قوم میں زنا کی بڑی کثرت ہوگئی، ہم ان کا لحاظ کرنے لگے، جب کوئی رذیل اور چھوٹا آدمی اس جرم کا مرتکب ہوتا تو ہم اصلی حد جاری کر کے اسے سنگسار کرتے اور امرا کو چھوڑ دیتے، بالآخر ہم نے غور و خوض کے بعد ایک متوسط درجہ کی سزا تجویز کی یعنی سنگسار کرنے کے بجائے کوڑے مارنا اور منہ کالا کرنا۔ اب یہی شرعی قانون کی حیثیت سے جاری ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ایک یہودی کو توراۃ کی عبارت جسمیں حد زنا کی تصریح تھی پڑھنے کے لیے حکم دیا تو اس نے آگے پیچھے کی عبارت تو پڑھ دی مگر آیت رجم پر ہاتھ رکھکر چھپا دینا چاہا۔

مخزومی عورت پر جب قضائے اسلامی نے چوری کے بدلہ میں قطع ید کا فیصلہ کیا تو لوگوں کے کہنے کی وجہ سے اُسامہ بن زید نے اس کے حق میں سفارش کی، داعی حق یعنی خلافت الٰہی کے موسس اور احکام الٰہی کے مبلغ کا چہرۂ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلے کی قومیں اسی وجہ سے عتاب خداوندی کی زد میں آکر ہمیشہ کے لیے ہلاک ہوگئیں کہ جب کوئی بڑا اور امیر شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی غریب اور معمولی انسان اسی جرم

یں گرفتار رہتا تو لوگ اس پر حد جاری کر دیتے۔ (صحیح مسلم کتاب الحدود)

احکام شرعی میں اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی جرأت اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا جو قدم اٹھاتے وہ احکام دین اور مشعل ہدایت کی روشنی میں نہیں بلکہ نفس کی ظلمتوں اور دنیا طلبی کی خوفناک تیرگیوں میں اٹھاتے۔ وہ حاملین توراۃ ضرور کہلاتے تھے لیکن ان کے عرصۂ حیات کا ایک ایک گوشہ اس کے جمال مقدس کی تابانیوں سے بے نور تھا۔ آخر کار یہی ہوا کہ انہوں نے انسانی فرائض کے سارے حدود توڑ ڈالے اور بدترین خلائق میں جا ملے۔ ان کی مثال کس قدر عبرت انگیز ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (جمعہ ۱)

جن لوگوں کے سر توراۃ لادی گئی (جن کو دی گئی) پھر انہوں نے اس کو نہ اٹھایا (اس پر کاربند نہ ہوئے) ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔

جب انہوں نے اپنا الحاق انعام اور بہائم سے کر لیا تو پھر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ خداوندی برکات سے محروم ہو کر رہ جاتے، ذل و مسکنت ان کی پیشانی کا طرۂ امتیاز بنتی، رضائے الٰہی اپنا رخ ان سے پھیر لیتی۔ انہوں نے قانون الٰہی سے بغاوت کی تھی۔ کائنات الٰہی نے ان سے بغاوت کی۔ انہوں نے اللہ کی زمین پر فساد کی گرم بازاری کی، زمین کی ساری نعمتیں ان سے روٹھ گئیں۔ انہوں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا قدرت کی لعنتوں کے مستحق اور مغضوب ٹھہرے اور خدا نے صاف کہدیا۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ الآیۃ (مائدہ ۱۰)۔

اے پیغمبر ان سے کہدو کہ اے اہل کتاب تم نہیں ہو کسی چیز پر جب تک کہ توراۃ و انجیل کو قائم نہ کرو نیز اس چیز کو جو تمہارے رب کی جانب سے جو تم پر نازل ہوئی ہے

یعنی تمہارا شرف و مجد بس اقامت کتاب اور حدود الٰہی کی تعلیم ہی تک تھا۔ تم نے اس مبارک سررشتہ کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرح کی رسوائیاں تمہارے گلے کا طوق بن رہی ہیں۔

اس ورطۂ ہلاکت سے نکلنے اور ذلت ونکبت کے جہنمی حضیض سے نجات پانے کی صرف ایک ہی شکل ہے، نفس اور خود پرستی کے ایک ایک بندھن کو کاٹ ڈالو، قوانین الٰہیہ کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناؤ تمہاری سعادت کے مٹے ہوئے نقوش پھر ابھر آئیں گے، زمین کی آغوش محبت تمہارے لئے کھل جائے گی اور آسمان کا دست شفقت تمہارے سروں پر ہوگا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔ آیۃ (توبہ ۱)

اور اگر یہ لوگ توراۃ وانجیل کو قائم کرتے اور اس چیز کو جو ان کے پروردگار کی طرف سے اتری ہے تو یقیناً کھاتے وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں تلے سے۔

لیکن ان یہود کا حال یہ تھا کہ اپنے خود ساختہ اصول وقوانین کے سامنے نصوص الٰہیہ اور احکام شرعیہ کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دیتے۔ خدا کا آخری مہیمن کلام جب نازل ہوا اور اس نے باطل کے سارے حجاب اٹھا کر خلافت الٰہی کی از سر نو تاسیس کرنی چاہی، اور احکام خداوندی کو ارض الٰہی کے اوپر نافذ کرنا چاہا تو یہ یہود کہا کرتے تھے اگر یہ پیغمبر ہمارے منشا اور مطلب اور ہمارے آئین کے مطابق کہے اور فیصلہ کرے تو اسے مان لو ورنہ ٹھکرا دو۔ وَيَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا۔

یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ تمہارے لیے آپس کی خانہ جنگی اور خونریزی اور ایک دوسرے کے خلاف میدان جنگ میں صف آرائی حرام ہے۔ کسی اسرائیلی کو غلام بنانا بھی ان کے لیے جائز نہ تھا لیکن زر پرستی نے جو ان کی قومی فطرت کا خمیر ہے انھیں مجبور کر دیا اور پھر ایسا ہوا کہ علی الاعلان ایک دوسرے کے خلاف لشکر آرائی اور قتل وخونریزی کرنا ان کا محبوب ترین شغلہ بن گیا صرف اس لالچ کی بنا پر کہ جنگ میں ہاتھ آئیں گے تو فدیہ میں بڑی بڑی رقمیں حاصل کریں گے۔ غلام بنا کر رکھنا تو حرام لیکن غنائم اور فدیے حاصل کرنے کے شوق میں فتنہ وفساد اور جنگ وپیکار سب حلال ہیں کیونکہ اگر اس حکم کی حرمت بھی برقرار رکھتے

تو پھر نفس کی تشنگی کیسے دور ہو؟ یہ تھی ان شہدائے حق کی حقیقت نوازی اور حق پرستی۔ اللہ نے ان مفسدہ پرداز باغیان حق کو مخاطب کر کے کہا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ..... اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔ (بقرہ ۱۰)

اور جب ہم نے تم سے میثاق لیا کہ تم اپنے لوگوں کا خون نہ بہانا، اور نہ انھیں گھروں سے (جنگ کر کے) نکالنا ...... کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے اور بعض سے اعراض کرتے ہو؟ پس جو شخص تم میں سے ایسا کرے اس کے لیے کوئی بدلہ نہیں بجز اس کے کہ دنیا میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ایسے تمام لوگ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

یہودیوں کے متعلق قرآن میں متعدد مقامات پر تصریحات موجود ہیں کہ توراۃ کے احکام کو انہوں نے چھوڑ کر حسب خواہش اپنے من گھڑت آئین و قوانین کو نافذ کر رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ پیغمبر اسلام کی طرف معاملات کو فیصل کرانے کے لیے رجوع کرتے تھے، قرآن حکیم نے ان سے پوچھا کہ تم ایک طرف تو توراۃ کے احکام کو ٹھکراتے ہو اور انھیں قابل عمل نہیں سمجھتے، دوسری طرف داعی اسلام کو حکم قرار دیتے ہو، جو بہر حال احکام خداوندی کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے تو کیا تم ان کے فیصلوں کے آگے اپنی سرکش اور خود بین گردنوں کو ڈال دو گے؟

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۔

حدود و قصاص کے بارے میں انہوں نے دل کھول کر تصرف کیا، احکم الحاکمین کا بے لچک اور مساوی قانون سارے اسرائیلیوں کے لیے ایک تھا لیکن انہوں نے اس مساوات کو ظلم اور خلاف عدل

بنا کر چھوڑا، اور لوگوں کے مراتب کے لحاظ سے قانون میں کمی وبیشی کرنے لگے؛ اللہ کے نزدیک بندوں کی یہ دراز دستیاں کفر، فسق اور ظلم سمجھی جاتی ہیں۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔

اللہ کی حکومت قائم کرنے والے اگر اس طرح اُسے مٹانے پر تل جائیں اور حدود الٰہی کو توڑ کر سطح ارض پر جیت اور طاغوت کی فرمانروائی کا تخت بچھا دیں تو پھر تعجب ہے اگر سنت الٰہیہ ان کے تاج غرور کو ذلت ومسکنت کے پاؤں سے روند نہ دے اور دنیا کی چند روزہ اور آخرت کی سرمدی رسوائیوں کا دردناک عذاب انہیں نہ دے۔ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ إِلَّا خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا۔ الآیۃ (باقی)

مقاصد قرآن

از جناب مولانا صبغۃ اللہ حسینی صاحب استاذ جامعہ دارالاسلام عمرآباد

(۴)

روزہ! یہ بھی ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے جس کو اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ انسان کے ملکی جذبات نشو و نما پاکر اپنے ارتقائی منازل پر پہنچ سکیں اور جس قدر بہیمی اور سفلی میلانات ہیں ان کی قوت ٹوٹ جائے تاکہ انسان برائیوں سے محفوظ رہ سکے۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے احکام کسی قدر مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اس کے فوائد و منافع پر بھی نہایت دل نشین پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ روزہ کی فرضیت اور اس کے فلسفہ کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (سورہ بقرہ۔ رکوع ۲۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے جاتے ہیں جس طرح تم سے پیشتر کے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

"صوم" کے معنی لغت میں مطلق رک جانے کے آتے ہیں اور شریعت نے اس کو ایک خاص معنی کے لیے استعمال کیا ہے یعنی صبح صادق سے آفتاب کے غروب ہو جانے تک کھانے، پینے اور مباشرت سے رکے رہنا۔ قرآن عزیز ہم کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ کوئی نئی عبادت نہیں جو نوع انسانی پر ڈالی جا رہی ہے بلکہ پچھلی قوموں اور امتوں پر بھی اس کو لازم قرار دیا گیا تھا۔ خصوصاً عاشورہ کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات ملی تو یہودیوں نے اس دن روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ اسی طرح عیسائیوں میں بھی روزہ رکھنے کا دستور تھا۔ مگر انہوں نے جس طرح

اور اعمال صالحہ کو کفار کے عقیدہ کی بنا پر پس پشت ڈال دیا اسی طرح روزہ سے بے توجہی برتی بہر حال دنیا کے تمام مذاہب و ملل اور اقوام میں یہ عبادت رائج تھی گو اس کی نوعیت میں کسی قدر اختلاف تھا۔

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" میں فرضیت صوم کی وجہ اور صوم کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ نیز اس کا فلسفہ تبلایا جا رہا ہے کہ اس عبادت کے ذریعہ نہ صرف اشخاص کی روحانی اصلاح ہوتی ہے بلکہ اجتماعی زندگی بھی برائیوں سے پاک اور بھلائیوں سے لبریز ہو جاتی ہے مالداروں کو اس چیز کا اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے کہ بھوک اور پیاس میں غریبوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ اسی کے باعث شکم سیروں اور فاقہ مستوں کو ایک سطح پر کھڑا کیا گیا ہے جس کے ذریعہ مساوات عمومی کا تخیل عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر یہی وہ عبادت ہے جس کی وجہ سے ملکوتی قویٰ میں تقویت اور بہیمی جذبات میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور خدا رسی اور خدا ترسی کے احساسات تیز سے تیز تر ہو جاتے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے سخت پیاس ہو رہی ہے، تن تنہا روزہ دار بیٹھا ہوا ہے اور مکان میں ٹھنڈا پانی رکھا ہوا ہے مگر وہ نہیں پیتا، روزہ دار کو سخت بھوک لگی ہوئی ہے، بھوک کی وجہ سے جسم میں ضعف بھی محسوس ہو رہا ہے کھانا موجود ہے دیکھنے والا بھی کوئی انسان نہیں مگر وہ نہیں کھاتا۔ دل پسند حسین و جمیل بیوی پاس بیٹھی ہوئی ہے، فریفتگی کے جذبات، محبت کی امنگیں دونوں میں موجزن ہیں لیکن ان سب کی طرف روزہ دار کی خواہش نہیں ہوتی اور وہ احتراز کرتا ہے اس لیے کہ اس کے دل میں اس خدا کی عزت اور اس کے حکم کی حرمت بیٹھ چکی ہے جو اس کی ہر ایک کھلی چھپی حالت کو جانتا ہے اور اس خداوند قدوس کا جلال اس کے دل میں سما گیا ہے جس کے آگے کسی کی کوئی قوت نہیں چل سکتی پھر جب انسان اپنے حقیقی پروردگار کے حکم سے جائز، پاکیزہ اور حلال خواہشوں کو چھوڑ دینے کا اپنے آپ کو خوگر بنائے گا تو اسی خدا کے خوف سے حرام، ناجائز اور ناشائستہ حرکتوں کو چھوڑ دینے کی اس میں زیادہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ یہی طاقت ہے، جو روزہ دار کے اندر پیدا کر دینا اسلامی شریعت کا مقصد ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار جھوٹ بولنا، لغو بکنا اور

بیہودہ کاموں کو نہیں چھوڑتا تو خداوند تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا وغیرہ ترک کرنے کی کوئی پرواہ نہیں۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص روزہ رکھے تو نہ بیہودہ باتیں زبان سے نکالے اور نہ شور و شغب کرے، اور اگر کوئی اس کو گالیاں دے تو کہدے میں روزہ دار ہوں یہ کام میرے لیے سزاوار نہیں۔

غرض اس عبادت کے ذریعہ انسان میں ملکات فاضلہ پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ خلافت الٰہی کی امانت اس کے سپرد کردی جائے۔ اب اس میں اس اہم کام کے سنبھالنے کی کافی استعداد پیدا ہوچکی ہے۔

حج حج کے معنی لغت میں ارادہ کرنے کے آتے ہیں اور عمرہ کے معنی زیارت کرنے اور آباد کرنے کے ہیں۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں "حج و عمرہ" ان خاص مراسم و عبادات کی ادائگی کے لیے سفر کرنے کو کہتے ہیں جو بیت اللہ الحرام سے مخصوص ہیں اور جن کے باعث کعبہ کی آبادی ہوتی ہے۔

اسلام کی ان چار بنیادوں میں سے جن پر قصر اسلامی کی عمارت کھڑی ہے ایک حج بھی ہے یہی وہ خاص عبادت ہے جو سوائے بیت اللہ الحرام کے اور کسی مقام پر ادا نہیں کی جاسکتی۔ بخلاف نماز، زکوٰۃ اور روزہ کہ ہر مقام پر اپنے اوقات و شروط کے ساتھ ادا ہوسکتے ہیں۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام عبادتیں تو مکانی خصوصیت سے علٰحدہ ہیں اور صرف یہی عبادت کیوں ایک مکان مخصوص کے ساتھ مختص کردی گئی ہے حالانکہ تمام روئے زمین خدائے تعالیٰ ہی نے بنائی ہے؟ بے شک تمام زمین خدا ہی کی ہے اور امت محمدی کے لیے کل روئے زمین کو مسجد بنادیا گیا ہے لیکن ہر خطۂ زمین میں وہ خصوصیات نہیں ہیں جو اس بقعہ نور سے تعلق رکھتی ہیں یہی وہ مقام مبارک ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی اور تمام لوگوں میں اس بات کی منادی کردی کہ پیادہ یا سواریوں پر ہر طرف سے چلے آئیں۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (حج-۴)

اور تم لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر سوار بھی چلے آئیں گے جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔

تمام انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چند خصوصیات حاصل ہیں۔ اول یہ کہ آپ ہی تمام قوموں کے مسلم الثبوت پیغمبر ہیں۔ اور آپ ہی کو تمام دنیا والوں کے لیے امام بنایا گیا ہے اور یہ "امامت کبریٰ" کا جلیل القدر منصب بھی بہت سی آزمائشوں سے کامیاب گذرنے اور بہت سی قربانیاں دینے کے بعد عطا کیا گیا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم ہی کا وہ خاندان ہے جس میں صدیوں تک نبوت رہی حتّٰی کہ آپ ہی کے خاندان سے خدا کا آخری پیغمبر پیدا ہوا جس کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہوئی اور جس اسلام کی حقیقت کو ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا وہ تمام مدارج ارتقا طے کرتا ہوا دور محمدی میں آکر اپنے شباب پر پہنچ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی پر غور کرنے سے "توحید" اور "اسلام" کی حقیقتیں پوری طرح آشکارا ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو قرآن عزیز نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے اسی طرح حضرت ابراہیم کی عملی زندگی کو بھی امت اسلامیہ کے لیے نمونۂ عمل بنایا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ۔

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں ایک نمونہ تھا۔

غرض مکۂ مکرمہ کو حضرت ابراہیم کی ذات سے اور حضرت ابراہیم کو "حقائق اسلامی" سے گہرا تعلق ہے جس کی بنا پر اس عبادت کو خانۂ کعبہ ہی کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرما کر مدینۂ طیبہ تشریف لانے کے بعد بھی حج فرض نہیں ہوا بلکہ مکۂ معظمہ کے فتح ہوجانے کے بعد ۸ھ میں حج وعمرہ کا حکم دیا گیا اور سب سے پہلا حج ۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی قیادت میں کیا گیا۔ پھر اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ

میں اعلان فرمایا کہ میں حج کو جانے والا ہوں تو بے شمار پروانے شمع محمدی کے ارد گرد جمع ہوگئے اور یہی آپ کا پہلا اور آخری حج تھا جس کو "حجۃ الوداع" کہتے ہیں جس میں آپ نے نہایت زبردست خطبہ دیا تھا اور اسی وقت تکمیل دین کی بشارت دی گئی تھی۔

بہرحال حج ایک زبردست اسلامی فریضہ ہے جس کے ادا کرنے کے لیے شوال سے ذوالحجہ تک تک کا زمانہ مقرر کیا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ (سورہ بقر - ۲۵) حج کے چند مہینے مقرر ہیں (شوال، ذی قعدہ، اور ذی الحجہ)

اور حج انہیں لوگوں پر فرض ہے جو استطاعت رکھتے ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ۔ (سورۂ آل عمران رکوع ۱۰)۔ اور لوگوں کے ذمہ اللہ کے واسطے بیت اللہ الحرام کا حج کرنا ہے اس شخص پر جو راستے کی طاقت رکھتا ہے (یعنی زاد و راحلہ پر قادر ہو) اور جو منکر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سب عالم والوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں استطاعت کے ہوتے ہوئے حج نہ کرنے کو "کفر" سے تعبیر کیا ہے جو نہایت شدید وعید ہے آج کل عام طور پر یہ خیال ہو گیا ہے کہ حج کو جانے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کے کاموں سے فارغ ہو جائیں۔ خاندانی معاملات طے ہو جائیں۔ خاندان میں ہونے والی شادیاں ہو چکیں۔ غرض جب دنیا میں کوئی کرنے کا کام باقی نہ رہے، تب خدا کے گھر کا رخ کیا جائے۔ حالانکہ اگر دل میں کچھ بھی خدا کی محبت ہو اور حساب و کتاب کا کچھ بھی خیال ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ جس وقت اس میں سفر کی استطاعت پیدا ہو جائے، وہ سب کاموں سے پہلے کعبہ کا رخ کرے۔ حدیث میں ایسے شخص کے لیے سخت وعیدیں آئی ہیں جو استطاعت رکھ کر بھی حج کو نہیں جاتا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص صحیح سالم ہو اور حج کرنے پر قادر ہو پھر ادا نہ کرے اور مر جائے تو چاہے یہودی ہو کر مر جائے یا

عیسائی ہو کر وہ اسلام کی موت تو نہیں مرتا۔

جس طرح اسلام نے ہر عبادت کے اندر فوائد و اسرار رکھے ہیں اسی طرح حج میں بھی بے شمار فائدے اور اَن گنت دینی و دنیوی منافع اور مصالح ہیں بلکہ اسلامی عبادتوں میں جس ہیئت اجتماعی کی تشکیل مدنظر ہے اس کی تکمیل یہیں آ کر ہوتی ہے۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ وحدتِ اُمت کا تخیل بغیر اس کے جامۂ عمل نہیں پہن سکتا کہ اس امت کے لیے کوئی مرکز مقرر کیا جائے جہاں اطراف عالم کے مسلمان لازمی طور پر جمع ہوں ایک دوسرے کے حال سے واقف ہوں مل کر ایک خدا کی عبادت کریں، ایک مرکز کے گرد گھومیں، اور دل میں شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر یہ نقش تازہ کر کے جائیں کہ ہم ایک خدا کے پرستار ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا قومی اجتماع کسی ایسے مقام پر نہیں ہو سکتا جہاں اگرچہ مادی تمدن کے لوازم اور اس کے طمطراق کی چیزیں تو سب کچھ موجود ہوں مگر کوئی روحانی وقار نہ ہو اسی لیے اس مبارک مقصد کے لیے ”وادی غیر ذی ذرع“ کو منتخب کیا گیا تاکہ اس اجتماع کا مقام ایک ایسا مقام ہو جس سے اسلام کی بہترین روایات وابستہ ہوں، جس کا ذرّہ ذرّہ خدا کے نام پر مرنے والوں کی زندگی کا شاہد ہو، جہاں آیات الٰہی ہر طرف چھائی ہوئی ہوں اور کفر و شرک کا نام و نشان تک نہ ہو، جہاں امت مسلمہ کو پوری آزادی حاصل ہو اور کوئی خارجی اثر مسلم اور مسلم کے درمیان حائل نہ ہو۔ ایسی فضا میں جب مسلمان جمع ہوں گے تو وہ اپنے دامن نہ صرف روحانی برکتوں سے بھر کر واپس ہوں گے بلکہ ہر قسم کی دنیوی اور مادی منفعتیں بھی ان کو حاصل ہوں گی اسی کی طرف اشارہ ہے قرآن کی اس آیت میں کہ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ۔

یہی سبب ہے کہ دشمنان اسلام نے ”خلافت“ کے بعد اگر کسی چیز کو بھانپا ہے تو وہ یہی عبادت حج ہے آئے دن مختلف غیر اسلامی حکومتوں کی طرف سے اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں کہ

کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ غلام مسلمان آزاد مسلمانوں سے دادی بطحا میں ملیں اس لیے کہ جب وہ واپس اپنے اپنے ملک کو لوٹ کر جائیں گے تو ظاہر ہے کہ ان میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوگی، اور وہ کسی غیر اسلامی حکومت کا جوا اپنی گردن میں ڈالے رہنے کو ہرگز پسند نہ کریں گے، اور خود آزاد مسلمان قوموں میں بھی ان کے لیے ہمدردی و اعانت کے جذبات پیدا ہوں گے۔

الحاصل اسلامی عبادات پر غور کرنے سے یہ چیز اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن حکیم کا مقصد محض ایک ایسی نظری تعلیم پیش کرنا نہیں ہے جو کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوسکے بلکہ وہ ایسی تعلیمات پیش کرتا ہے جو نظری اور عملی دونوں اعتبار سے نوع انسانی کے لیے کامیابی کا اعلیٰ ذریعہ بن جاتی ہیں بخلاف اس کے اگر آپ عیسائیوں کی تعلیم پر ایک سطحی نگاہ ڈالیں تو یہ امر بالکل واضح ہوجائے گا کہ جو طریقہ مسیحیت نے انسانی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ خالص خیالی فلسفہ ہے اس کو عملی دنیا سے کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ انسانی فطرت کے مقتضیات کے مناسب نہیں ہے۔

مثال کے طور پر مسیحیت دنیا کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ دشمنوں سے بھی دوستی اور محبت کرنی چاہیے اور جو شخص برائی سے پیش آئے اس کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنا چاہیے۔ اگر کوئی سیدھے رخسار پر طمانچہ مار دے تو دوسرا گال بھی اس کے روبرو پیش کر دیا جائے۔ یہ ایک کھلی بات ہے کہ ایسے احکام پر عمل کرنا بہت شاق گزرتا ہے کسی خوددار، غیرت پسند انسان سے تو یہ ممکن نہیں، ہاں کوئی ذلت پسند اور دنی الطبع اس کو برداشت کرلے تو کرلے۔ اگر اس پر عمل کرلیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوجائیگا اور زبردست لوگ کمزور انسانوں کو اپنے ظلم و جور کا تختۂ مشق بنالیں گے اور اگر اس کو رد کردیا جائے گا تو مسیحیت کے معتقدین کے پاس کوئی ایسا اخلاقی ضابطہ باقی نہ رہے گا جو دنیوی حکمرانی میں ان کو راہ راست پر قائم رکھے نتیجہ یہ ہوگا کہ مسیح کی بھیڑیں منقلب ہوکر بھیڑیوں کی شکل اختیار کرلیں گی، چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ کشت و خون اور ظلم و ستم وہی لوگ کر رہے ہیں جو مسیح

اور ان کی تعلیم پر ایمان لانے کے مدعی ہیں۔

اسی لیے دین فطرت نے اپنے احکام و قوانین اور اوامر و نواہی کے اصول و فروع کی بنیاد ہی ایسی حکمتوں اور مصلحتوں پر رکھی ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، اور ایسی تکلیف کا انسانوں پر بوجھ نہیں ڈالا جو بشری طاقت کی برداشت سے باہر ہو۔ بلکہ قرآن عزیز نے ان مواقع پر جو ہدایات فرمائی ہیں وہ عدل و انصاف اور مساوات پر مبنی ہیں چنانچہ پروردگار عالم کا ارشاد ہوتا ہے۔

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ - إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ (شوریٰ۔ رکوع ۴)

اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے بے شک اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو شخص ظلم کیے جانے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اوروں پر ستم ڈھاتے ہیں اور ناحق احد کی زمین پر بغاوت پھیلاتے ہیں، انہیں لوگوں کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہوگا۔

غور کیجیے کہ قرآن کریم نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے اور عدل کے مراتب کی تشریح کی ہے اور پھر عقلی مصلحت کا کیسا لحاظ کیا گیا ہے۔ کیا ایسی بہترین اصلاح قرآن کے نازل ہونے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے بھی دنیا میں موجود تھی!

مسیح نے اپنے پیروؤں کو تعلیم دی تھی کہ "دنیا چھوڑ دو" مال و دولت کو ٹھوکر مار دو" انہوں نے مالداروں کی یہاں تک مذمت فرمائی کہ "سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا گھسنا تو ممکن ہو سکتا ہے مگر کسی مالدار کا

اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونا ممکن نہیں"۔

شاید ان دو باتوں کو دیکھ کر کوئی سطحی رائے رکھنے والا یہ سمجھ لے کہ یہ دائمی قانون تھا نہیں بلکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک وقتی اور عارضی اصلاح تھی کیونکہ یہودیوں میں سرمایہ پرستی بہت بڑھ چکی تھی اور وہ مال کی محبت میں اس درجہ غلو کر گئے تھے کہ اس کے باعث اخلاق اور عادات و دینی رسوم وعوائد تک میں انہوں نے پہلوتہی کرنی شروع کر دی تھی چونکہ یہودی ایک انتہا پر پہنچ چکے تھے' اس لیے مسیحؑ ان کی افراط کو توڑنے کے لیے انہیں دوسری انتہا کی طرف لے گئے۔ مگر اعتدال کا مقام انہوں نے نہیں بتایا۔ یہ کام شریعت محمدی کا تھا کہ اس نے دولت و ثروت کے مقابلہ میں ایک معتدل اور قابل عمل ضابطہ سے دنیا کو روشناس کیا۔ اس نے ایک طرف دولت کمانے کے طریقوں میں امتیاز پیدا کیا اور دوسری طرف دولت صرف کرنے کی صورتوں میں تمیز پیدا کی۔ اگر کوئی شخص حلال طریقے سے کمائے اور جائز راستوں میں صرف کرے تو اس کی دولت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو' اس کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ وہ اس کی وجہ سے آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکا نہ جائے گا بلکہ یہی دولت اس کو آسمانی بادشاہت میں لے جائے گی اور بڑے مرتبے دلوائے گی بخلاف اس کے اگر کوئی شخص حرام طریقہ سے کمائے اور حرام طریقوں میں صرف کرے یا جمع رکھے تو اس کی دولت یقیناً اس کے لیے ہلاکت کی موجب ہوگی۔ یہ ہے وہ اعتدال جو اسلام نے پیدا کیا اور یہی وہ قانون ہے جو دائمی اور عالمگیر بن سکتا ہے۔

خاتمۂ سخن | دین اسلامی کے تینوں ارکان ایمان باللہ' ایمان بالیوم الآخر اور عمل صالح کے متعلق ہم نے کسی قدر تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس کی اور بہت کچھ تفصیل کی جا سکتی ہے۔ اور یہی مشترک حقیقت تمام آسمانی مذاہب میں موجود ہے اور جتنی بھی صداقتیں ہم کو نظر آ رہی ہیں وہ سب اسلام ہی اسلام ہیں البتہ قوموں نے اپنی اصلی اور صحیح تعلیمات کو بھلا دیا تھا "وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ" تو خداوند قدوس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور قرآن عزیز

کو نازل کیا تاکہ قوموں اور ملتوں کی گمراہیاں تبلائی جائیں، ان کی غلط کاریوں کی اصلاح کی جائے، "وحدت نوع انسانی" اپنی صحیح شکل و صورت میں نمودار ہو کر فطرت کے مطابق فاطر السموات والارض ہی کے آگے سر نیاز خم کرے، اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللہِ کی حکومت نیست و نابود ہو جائے انسان کے کمال فطری کی تکمیل ہو اور وہ "احسن تقویم" کا پورا پورا مظہر بن جائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی جنگ[1]

از جناب خان بہادر نواب محمد ذکاء اللہ خاں صاحب ایم۔اے

جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مدیر "ترجمان القرآن" نے اسلامی ہند کے مستقبل اور مسلمانوں کے آج کل کی سیاسی کشمکش میں شرکت کے متعلق ایک نہایت اہم مضمون سپرد قلم کیا ہے جو ترجمان القرآن کی گذشتہ چند اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

فاضل مدیر نے اپنے اس مضمون میں مسئلۂ زیر بحث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر خلوص اور سچے جذبۂ اسلامی سے متاثر ہو کر لکھا ہے کہ اس مضمون سے کلاً یا جزاً اختلاف کرتے ہوئے دل دکھتا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو مولانا کی رائے سے مسئلۂ ہذا کی بحث کے کسی جزو سے اختلاف ہو، جیسا کہ راقم الحروف کو مولانا کے اکثر تسلیم کردہ قضایا اور ان کے نتائج سے ہے، مگر وہ مولانا کے صحیح جذبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی اصلی رائے کا اظہار نہ کرے، تو وہ نہ صرف اظہار حق ہی میں قاصر رہیگا بلکہ مولانا ممدوح کے اس مقصد کے فوت کرنے کا باعث بھی ہوگا جو اس بحث کے چھیڑنے سے ہے یعنی اہل الرائے مسلمانوں کا آزادانہ طور پر تبادلۂ خیالات کرنا اور اس کے ذریعہ سے اپنے لیے کوئی متفقہ لائحۂ عمل تجویز کرنا۔

مگر نفس مضمون پر بحث شروع کرنے سے پہلے میں مولانا کو اس امر کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بیش قیمت رسالہ میں اس بحث کو چھیڑ کر علماء کرام کی توجہ ان سیاسی مسائل کی طرف دلائی، چنانچہ جریدۂ الفرقان (بریلی) نے بھی مولانا کے اس مضمون کے بڑے حصہ کو ماہ جمادی الاولیٰ

[1] ترجمان القرآن: اس مضمون میں جتنے اہم نکات بحث طلب ہیں ان پر ہم نے نمبر لگا دیے ہیں تاکہ ہم کو اپنے جواب میں عبارتیں نقل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے ناظرین ہر نمبر کا جواب بھی ساتھ دیکھتے جائیں تاکہ انہیں اس بحث کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

کی اشاعت میں ایک موثر نوٹ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ امید ہے کہ مولانا کے مضمون کا یکے بعد دیگرے ان ہم دو رسالوں میں شائع ہو جانا ضرور علماء کرام کی توجہ کا باعث ہوگا اور علماء کرام ضروری بحث و تمحیص کے بعد کوئی سیدھا سے سیدھا طریق کار تجویز فرما دیں گے' اور وہ بھی جلد از جلد کیونکہ اب ایک منٹ بلکہ ایک لمحہ کے ضائع کرنے کی بھی مہلت نہیں ہے'۔

مضمون مذکور کی نسبت سب سے پہلے جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مضمون اس قدر بلند پایہ' اور فاضلانہ ہے کہ اس کو خواص ہی سمجھ سکتے ہیں' اور وہی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں' عوام کے فہم اور ادراک سے وہ بالاتر ہے حالانکہ کسی ایسے مسئلہ کی بابت جو سیاسیات سے متعلق ہو' اور جس کی نسبت اس امر کی ضرورت ہے کہ ہر خاص و عام اپنی رائے قائم کرنے کے لیے غور و فکر کرے' اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے' اس بات کی ضرورت تھی کہ بحث عام فہم ہوتی تاکہ عوام اس سے فائدہ اٹھا سکتے

اب اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہوئے مجھکو یہ عرض کرنا ہے کہ لائق مضمون نگار نے ایک نہایت فاضلانہ تمہید میں سیاسی کام کرنے کے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آجکل عمل پیرا ہیں لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد خود جو طریقہ کار مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے اگر اس کے سمجھنے میں میں غلطی پر نہیں ہوں تو وہ طریقہ بالکل ہی ناقابل العمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے' چنانچہ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"مذکورہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھکر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے لیے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان کی آزادی کا حصول ممکن ہو اس غرض کے لیے ہمکو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنا چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں"۔

اس کے بعد مولنا موصوف نے اُن کاموں کو گنایا ہے جن پر جنگ آزادی میں شرکت کرنے سے پہلے ہمکو اپنی قوتیں صرف کرنا چاہئیں اور وہ بالفاظ مولنا مختصراً یہ ہیں۔

(۱) مسلمانوں میں ایک وسیع پیمانہ پر اصول اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جاوے۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً بھی احکام اسلام کا تبع بنانے کی کوشش کی جاوے۔

(۳) مسلمانوں کی رائے عامہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر مستعد ہو جاویں؛

(۴) ہمیں اپنی اجتماعی قوت کو اتنا مضبوط کرلینا چاہیے کہ ہم اپنی جماعت کے غداروں اور منافقوں کا استیصال کرسکیں؛

(۵) ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کی قیادت کا منصب ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آجاوے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر تو آمادہ ہو مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہو؛

(۶) مسلمانوں میں ایسا اتحاد عمل پیدا کردیا جائے کہ وہ سب تن واحد کی طرح ہو جاویں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں؛

یہ مقاصد بہت اعلیٰ و ارفع ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنا چاہیے مگر فاضل مضمون نگار نے یہ نہیں بتلایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اندازاً کس قدر مدت درکار ہوگی؟ اور اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حصول کے لیے صدیاں بھی کم ہیں۔ (۱)۔ تو کیا ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی رہے گی جبتک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہو جاویں؛ نیز اس نتیجہ پر پہنچنے میں مولنا سے یہ بات بھی نظر انداز ہوگئی ہے کہ سیاسی یا آزادی کی جنگ کا شروع کرنا

یا کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو اور جب تک ہم چاہیں وہ شروع نہ ہو۔ سیاسی یا آزادی کی جنگ تو بہت عرصہ ہوا شروع ہو چکی اور برادران وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے اور نئے معرکوں کے فتح کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ پس ایسی صورت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ۔

"بھائیو ذرا ٹھیرو، ہمیں بھی تیار ہو جانے دو، تب جنگ شروع کرنا"

ہماری ایسی آواز کو کون سن سکتا ہے؟ اور اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی کان دھر سکتا ہے؟ (۲)

سیاسی جنگ تو اصل میں ۱۸۸۱ء یا ۱۸۸۲ء میں شروع ہوئی تھی جبکہ کانگریس پہلے پہل عالم وجود میں آئی، سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ لائحہ عمل تجویز کیا جس پر مسلمان ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء تک عامل رہے اور اس کے بعد مسلم لیگ وجود میں آئی مگر سیاسی جنگ برابر جاری رہی، یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی اور جنگ کے دوران ہی میں مسٹر مانٹیگ (Montague) حکومت برطانیہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہندوستان آئے اور انہوں نے حکومت برطانیہ کی طرف سے اعلان کیا کہ "وہ آئندہ ہندوستانیوں کو حکومت ہند میں مزید اختیارات دیئے جائیں گے"۔ چنانچہ جنگ کے ختم ہوتے ہی Montague - chamsford Reforms) یا مانٹیگ چیمسفرڈ نامی اصلاحات وجود میں آئیں مگر ہندوستانی ان اصلاحات سے مطمئن نہ ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ (Non - Cooperation) یا عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی، جو ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں بہت زور پر رہی اس تحریک میں مسلمانوں نے بھی بڑے پیمانہ پر حصہ لیا کیونکہ مسئلہ خلافت کے متعلق دول یورپ نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیل گئی تھی اس لیے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کانگریس کی شریک کار بن گئی اور (Non - Cooperation) یا عدم تعاون اور (Civil disobidience) کی تحریک کو دبانے میں گورنمنٹ کی طرف سے جو تعزیری

کارروائیاں عمل میں آئیں اُن کو ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی برابر کے درجہ میں برداشت کیا چنانچہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک جو مسلمان عدم تعاون کی تحریک کے سلسلہ میں جیل گئے ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں آبادی کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

۱۹۲۲ء کے بعد بعض ان وجوہ سے جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے ہندو مسلمانوں کی راہیں پھر الگ ہونا شروع ہوگئیں اور مسلمان رفتہ رفتہ کانگریس سے علیحدہ ہونے لگے۔ چنانچہ ۳۱ء و ۳۲ء میں عدم تعاون کی تحریک نے جب دوبارہ زور پکڑا تو اس تحریک میں مسلمانوں کا حصہ نسبتاً بہت کم تھا۔ ۱۹۳۲ء کے آخر تک لارڈ ولنگ ڈن کی گورنمنٹ عدم تعاون اور (Civil disobidience) کی تحریک کو دبانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی، لیکن کانگریس نے اگرچہ (Civil disobidience) کی تحریک کو اٹھا لیا تاہم اُسنے اپنا پروپگنڈا عوام میں، کاشتکاروں اور مزدوروں میں برابر جاری رکھا اور چونکہ یہ پراپگنڈا امن عامہ کے مناقض نہیں تھا اس لیے گورنمنٹ نے بھی اس سے کچھ تعرض نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کا اثر عام رائے دہندگان پر بڑھتا گیا۔ ادھر گورنمنٹ برطانیہ نے تینوں گول میز کانفرنس (The Three Round Table Conferences) کی تجاویز کے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آف ۳۵ء پاس کرا دیا جس کی رو سے صوبہ جات میں کم از کم ہم ہندوستانیوں کو بہت کچھ اختیارات دیدئے گئے ہیں۔ چونکہ کانگریس نے ۱۹۳۲ء سے مسلسل کاشتکاروں، دستکاروں، اور مزدوروں میں اپنا پروپگنڈا جاری رکھا تھا اور اس کے علاوہ کوئی سیاسی پارٹی ایسے منظم طریقہ اور ایسی جد وجہد سے عوام میں کام نہیں کر رہی تھی اس لیے گذشتہ انتخابات میں کانگریس کو بہت ہی بڑے پیمانہ پر کامیابی حاصل ہوئی یعنی ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ بڑے صوبوں یعنی بہار، ممالک متحدہ آگرہ و اودھ، ممالک متوسط، مدراس اور بمبئی میں کانگریس ہی کو کامیابی ہوئی اور اس وقت ان سب صوبوں میں کانگریس ہی کی وزارت کام کر رہی ہے۔

پس جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا تھا کانگریس پارٹی آدھا معرکہ آپ سے پہلے ہی سر کر چکی ہے۔ اب اس کو صرف گورنمنٹ ہند میں اکثریت حاصل کرنے یا نہ کرنے کا معرکہ باقی رہ گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کا یا مسلمانوں کے کسی خاص گروہ کا یہ کہنا کہ ہم ابھی جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہم جیسے کچھ بھی ہیں اسی حالت میں ہم کو جنگ کرنا ہوگا، اگر ہمارے پاس اس جنگ کے لیے آلات نہیں ہیں تو ہم کو نہتے ہی لڑنا پڑے گا، اگر ہمارے ہتیار پرانے، دقیانوسی اور زنگ آلود ہیں تو انہیں دقیانوسی ہتیاروں کو استعمال کرنا ہوگا، یہ ایک اور بات ہے کہ دوران جنگ ہی میں ہم اپنے ہتیاروں کو صیقل اور انکا زنگ دور کرتے جاویں یا اور نئے ہتیار تیار کرتے جاویں، اور دراصل ہم کو ضرور ایسا ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے سوائے ہمارے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ اس وقت اس کا بھی موقع نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی خاص گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، اور نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیمیافتہ لوگ نئے تعلیمیافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہکر خارج کر دیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو اور اس لئے ان کو پرچم آزادی کے تلے کھڑے ہونیکی اجازت نہ دی جائے۔ اور نہ جدید تعلیمیافتہ حضرات کو اس امر کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ وہ پرانے تعلیمیافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یکدل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصہ لیں۔ اور کانھم بنیان مرصوص کا صحیح مصداق بن کر دنیا پر ثابت کر دیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، اور نیز یہ کہ دنیا کی کوئی طاقت کوئی قوت اور کوئی تدبیر اس نور الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جسکے مسلمان حامل ہیں۔ (۳)

مضمون کے اصل موضوع سے بحث کا جس قدر تعلق تھا وہ یہاں ختم ہو جاتا ہے لیکن فاضل مضمون نگار نے دوران تحریر میں بہت سی وہ ضمنی بحثیں بھی چھیڑ دی ہیں جو مضمون کے اصل

موضوع سے کچھ زیادہ متعلق نہ تھیں، اور چونکہ انہیں ضمنی بحثوں کو بہت زیادہ اہمیت دیگئی ہے اور میرے خیال میں یہی ضمنی بحثیں اصل موضوع سے زیادہ حضرات علماء کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کریں گی اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان ضمنی بحثوں کی بابت بھی تھوڑا بہت اظہار خیال کیا جاوے مگر ان ضمنی بحثوں میں ہر ایک بحث کے متعلق تنقید کرنا خالی از طوالت نہوگا۔ تاہم ان میں سے بعض کی بابت کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ناظرین کرام کے سامنے تصویر کے ہر دو رخ آجاویں'

ان ضمنی بحثوں میں سے جو ضروری ہیں وہ مولٰنا موصوف کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

"سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ...... مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سوچ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا مگر جذبات و تخیلات تو کچھ ایسے ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش نوے فی صدی لوگوں پر اس تعلیم کے نہایت مہلک اثرات مرتب ہوئے ...... وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے؟ اور مسلمان کس کو کہتے ہیں؟ اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز ما بہ الامتیاز ہے۔ خواہشات نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنالیا ہے اور یہ معبود انہیں اس مغربی تہذیب کی طرف لیے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر مطلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے ...... وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔

...... نماز پڑھنا ان کے یہاں معیوب ہے اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے اُسے

ان کی سوسائٹی میں بنایا جاتا ہے بخلاف اس کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن بلکہ ایک مہذب انسان کے لیے لوازم حیات میں سے ہے'۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں...... یہ چیز ابتک ہمارے مردوں میں تھی مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے ...... ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس کے طور طریق سے آراستہ کیا جارہا ہے"۔

المختصر مولٰنا کے خیال کے مطابق گذشتہ ستر سالہ مغربی تعلیم کے اثر سے مسلمان مسلمان نہیں رہے اور نیز یہ کہ گذشتہ ڈیڑھ صد سالہ غلامی کیوجہ سے مسلمانوں میں جو قومی ملی اور اخلاقی کمزوریاں اس دور کی ابتداء میں تھیں ان میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا اور ان کے علاوہ بھی دوسری اور نئی کمزوریاں ان میں پیدا ہوگئیں، خود غرضی انفرادیت، اور نفس پرستی کی وجہ سے قومیت کا احساس مسلمانوں سے مٹتا جارہا ہے اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے۔

متذکرہ بالا اقتباسات میں مولانا نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی بابت عموماً اور مغربی تعلیم نیز مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی بابت خصوصاً جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اگرچہ بہت زیادہ مایوس کن ہیں مگر چونکہ خیالات بالکل نیک نیتی پر مبنی ہیں اس لیے کسی کو مولٰنا سے کسی شکایت کا موقع نہیں ہے، اور معمولاً راقم الحروف اس بحث میں پڑنا پسند نہیں کرتا کہ مولٰنا کے یہ خیالات کہاں تک صحیح ہیں؟ مگر چونکہ علماء کے گروہ کو مغربی تعلیم سے ابتک اجتناب اور مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے ہمیشہ سوءظن ہتی رہا ہے اور اب بھی ہے اس لیے خطرہ تھا کہ فاضل مضمون نگار کے یہ خیالات جن کو نہایت ہی قوی اور موثر طریقہ سے ظاہر کیا گیا ہے اور جن کا مختصر سا نمونہ میں نے اوپر کے اقتباسات میں ہدیہ ناظرین کیا ہے علماء کے مغربی تعلیم کی طرف سے اجتناب اور مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے بدظنی کو کہیں اور زیادہ

نہ بڑھا دیں جس کی وجہ سے علماء کا گروہ نئے تعلیمیافتہ گروہ کے ساتھ موجودہ سیاسی جنگ میں بھی اشتراکِ عمل پسند نہ کرے حالانکہ ضرورت اس وقت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا ہر گروہ متفق، متحد، ایک رائے اور یک دل ہو کر موجودہ سیاسی جنگ میں حصہ لے۔ اس بارہ میں جو کچھ میں آئندہ عرض کرنے والا ہوں وہ صرف اسی مقصد کو مدنظر رکھکر عرض کروں گا۔

یہ تسلیم ہے کہ ہم میں خودغرضی و انفرادیت ہے، ہماری اجتماعی طاقت بہت ہی کمزور ہے مگر یہ سب کچھ الفاظ اضافی ہیں۔ ہمکو اپنی کمزوری بمقابلہ دیگر ہمعصر اقوام کے تسلیم ہے مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبون تر اور زیادہ خراب ہے اور مذکورۂ بالا اخلاقی خرابیاں اور سیاسی کمزوریاں پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو مستلزم ہوتا تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں اب سے تقریباً ایک ہزار برس گذر گئے مگر ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ آج سے ایک ہزار برس پہلے کے بہت اچھی اور بہتر ہے۔ مسلمانوں کی ہی حکومت کے زمانہ میں انہوں نے بہت سی علمی اور ذہنی ترقیاں کیں، عام بت پرستی سے انمیں کے بہت سے گروہوں نے توحید کی طرف رجوع کیا، اور اُن کی موجودہ ہر قسم کی ترقی تو کسی تشریح اور توضیح کی محتاج نہیں ہے۔ (۴)

پس مسلمانوں کی بابت بھی یہ کہنا کہ وہ گذشتہ ڈیڑھ صدسالہ عرصہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں زوال اور انحطاط ہی کی طرف گئے ہیں راقم الحروف کے نزدیک صحیح نہیں ہے، مسلمانوں نے بھی اس ڈیڑھ صدی میں کچھ نہ کچھ ترقی کی مگر ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم چنانچہ سلطنت مغلیہ کے انتزاع کے وقت یعنی اٹھارہویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کی حالت ہر حیثیت سے اس قدر پست ہو چکی تھی کہ اس سے زیادہ پست حالت کا نقشہ ذہن میں آنا مشکل ہے۔ سنہ ۱۷۶۱ء میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنی

بالکل فنا ہونے سے پہلے ایک آخری سنبھالا لیا تھا جبکہ شمالی ہند میں روہیلوں نے بسر کردگی نواب نجیب الدولہ و بامداد احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی متفقہ قوت کو پانی پت کے میدان میں ایک بڑی شکست دی تھی۔ اس کے بعد شمالی ہند میں مسلمانوں کی سیاسی قوت بجائے صفر کے رہ گئی۔ اس زمانہ میں سات سمندر پار سے ایک قوم ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتی ہے، اس کی بہت ہی محدود قوت مغلوں کی اسلامی سلطنت سے ٹکراتی ہے اور آن کی آن میں یہ اسلامی سلطنت پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اس دوران انتزاع میں مسلمانوں کا کوئی گروہ خواہ وہ گروہ علماء کا ہو، یا امراء کا، خواص کا ہو یا عوام کا غرض کوئی گروہ بھی ایسا کھڑا نہیں ہوتا جو اس اسلامی سلطنت کو اس انتزاع سے بچا سکے یا بچانے کی کوشش بھی کرے۔ البتہ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ضرور اخیر وقت میں علم جہاد بلند کیا مگر وہ بھی سکھوں کے خلاف۔ انگریزوں کے خلاف نہیں۔

اس وقت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس وقت کے مسلمانوں میں اپنے دین یا اپنی قوم کی حفاظت کا کوئی جذبہ باقی تھا، بلکہ بجائے اس کے کہ مسلمان متفق ہو کر اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے مذہب کی حفاظت کرتے وہ ایک دوسرے کے ساتھ غداری کرتے نظر آتے ہیں۔ بنگال میں میر قاسم اور میر جعفر اور سراج الدولہ ایک دوسرے کے ساتھ غداری کرتے ہیں تو وسط ہند میں شجاع الدولہ انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کا استیصال کرتا ہے جس کا نتیجہ خود شجاع الدولہ اور اس کے جانشینوں کے واسطے یہ نکلتا ہے کہ اس برائے نام فتح کے بعد شاہان اودہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رہتی۔

اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری موجودہ اقتصادی اور تعلیمی حالت آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی حالت سے ابتر ہے۔ طوائف الملوکی اور آئے دن کی خانہ جنگیوں میں کسی قوم کی اقتصادی حالت کیا خاک درست رہ سکتی ہے؟

علی ہذا یہی کیفیت تعلیمی حالت کی تھی عمومی تعلیم تو بالکل ہی مفقود تھی دینی تعلیم ضرور بعض بزرگوں کے طفیل (یعنی علماء فرنگی محل لکھنؤ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے خاندان) سے جاری رہی اور حقیقت میں ہم سب مسلمانوں کو ان بزرگوں کا مشکور ہونا چاہیئے، مگر انہیں کے پایہ کی آج موجودہ ہند میں دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیگر اسلامی درسگاہیں موجود ہیں۔

پس جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں ہماری موجودہ حالت آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی حالت سے بدتر نہیں ہے۔ البتہ اس درمیان میں ہم نے اُس سرعت رفتار سے ترقی نہیں کی جسکے ساتھ دوسری ہمسایہ اقوام نے ترقی کی ہے اور کسی قوم کا اپنی ہمسایہ اور ہمعصر اقوام کی رفتار پر ترقی نہ کرنا ہی اس کے تنزل کا مترادف ہے۔

دیگر اقوام ہند کی ترقی کی رفتار کے مطابق ہماری ترقی نہ کرنے کے مختلف اسباب ہیں اول تو ہم جدید تعلیم کی طرف بمقابلہ دیگر اقوام کے دیر سے آئے دوسرے یہ کہ جو سیاسی پالیسی سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے واسطے تجویز کی تھی اور جس پر کم و بیش ۱۹۰۶ء تک مسلمان عامل رہے وہ پالیسی ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا نہیں سکھلایا۔ اس لیے ہم سیاسیات میں دیگر اقوام ہند سے پیچھے رہ گئے اور اب اس کی ضرورت ہے کہ ہم اوروں سے تیز چل کر تلافی مافات کی کوشش کریں۔

علی ہذا یہ تسلیم ہے کہ مغربی تعلیم جس سے علوم اور انکشافات جدیدہ کی تعلیم مراد ہے وہ اپنے متعلمین میں نئے خیالات اور نئے احساسات پیدا کرتی ہے مگر یہ تسلیم نہیں کہ علوم جدیدہ کی تعلیم میں فی نفسہٖ کوئی ایسی بات ہے کہ وہ ایک مسلمان کو عقائد اسلام سے پھیر دے، وہ علوم جدیدہ کیا ہیں؟ یہی نا! کہ حقائق عالم کی بابت نئے نئے انکشافات، پس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کو ان نئے انکشافات کا علم اُن کے معتقدات سے کیوں برگشتہ کر دیگا؟

کہا جائیگا کہ جس ماحول میں ان نئے انکشافات کی تعلیم دی جاتی ہے وہ ایسا ہے کہ مسلمان طالب علموں کے دینی عقائد کو ایک حد تک متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک قابل تسلیم ہے مگر اس کا علاج یہ تو نہیں ہے کہ ہم ان علوم جدیدہ کی تعلیم کو ممنوع قرار دیدیں، اور اپنے گرد اگرد ایک حصار کھینچ لیں کہ نئے انکشافات کی روشنی ہم تک پہنچ ہی نہ سکے بلکہ اگر ہم مسلمان اپنے گرد اگرد ایک حصن حصین کھینچ لیں تب بھی ہم اپنے آپ کو ان نئے خیالات کے اثر سے محفوظ نہیں رکھ سکتے (۵)

فاضل مضمون نگار کو خود تسلیم ہے کہ علاوہ دیگر مغربی خیالات کے ایک نیا مغربی تخیل جو (Communism) یا اشتراکیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہندوستان میں پھیلتا جا رہا ہے، فاضل مضمون نگار کی رائے سے مجھے اتفاق ہے مگر عام ناظرین کی اطلاع کے لیے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ وہ تخیل ہے کہ جس کے خلاف یورپ کی تمام سرمایہ دار اقوام گذشتہ پندرہ بیس سال سے علم جہاد بلند کئے ہوئے ہیں۔ اور جس تخیل کی ہندوستان میں اشاعت کے خلاف گورنمنٹ آف انڈیا ابتدا ہی سے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے مگر تاہم ہندوستان میں Communism کے تخیل کی اشاعت کو روکا نہ جا سکا۔

لہٰذا علماء اگر مسلمانوں کو نئے علوم اور نئے خیالات کے اثرات سے (اگر کچھ ہوں) محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج اگر ہے تو صرف یہی کہ علماء خود اُن اداروں میں ان علوم جدیدہ کو جاری کریں جو ان کے زیر اثر یا زیر اہتمام کام کر رہے ہیں تاکہ ان علوم جدیدہ کی تعلیم ایسے ماحول میں دیجا سکے جس سے متعلمین کے مذہبی عقائد پر کوئی برا اثر نہ پڑ سکے۔

یہاں پہونچکر یہ کہا جائے گا کہ عربی مدارس کے ذرائع آمدنی ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنے یہاں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام کر سکیں، اور یہ بالکل صحیح ہے لیکن اگر علماء مجھکو معاف فرما دیں تو میں عرض کرونگا کہ اس موجودہ مالی حالت کے سسٹم کا ذمہ دار ایک حد تک خود علماء کا ہی گروہ ہے۔ اس لیے

کہ تعلیم دین جو عربی مدارس میں دیجاتی ہے وہ تو لازمی چیز تھی کیونکہ وہی مقصود بالذات ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کی کیا ضرورت تھی کہ طلبہ کا بہت سا وقت منطق اور فلسفہ قدیم کی تعلیم میں صرف کرایا جاوے؟ اور ان کے مقابلہ میں کارآمد علوم جیسے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم سے ان کو محروم رکھا جائے پس اگر ہمارے عربی مدارس دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مفید دنیوی تعلیم بھی اپنے نصاب میں شامل کرلیتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان پبلک عربی مدارس کی مالی امداد کما حقہٗ نہ کرتی۔ اس لیے اگر عربی مدارس کے موجودہ سسٹم مالی کی بابت یہ عرض کیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کہ ؎

نقص در دوستی ماست کہ او دشمن ماست ۔۔۔ آن محبت بہ چہ ارزد کہ سرایت نکند

عربی مدارس کی مالی حالت گو عموماً گری ہوئی ہے تاہم کچھ عربی مدارس ایسے ضرور ہیں کہ وہ اپنی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے علوم جدیدہ کی تعلیم کی کم از کم ابتدا ضرور کرسکتے ہیں مثلاً دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم ندوہ میری رائے میں ایسے ہی ہیں بشرطیکہ ان کے ارباب حل و عقد اس طرف توجہ کریں۔

لیکن عربی مدارس جبتک اپنے یہاں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام نہیں کرسکتے اس وقت تک کے لیے میں ایک دوسری تجویز علماء کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک معین تعداد نئی تعلیم کے مسلم اداروں میں (مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا اسلامیہ کالج لاہور) جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجے جاویں اور یہ کچھ مشکل امر نہیں ہے کہ نئی تعلیم کے ان مسلم اداروں کے منتظمین سے یہ بات طے کرلی جاوے کہ وہ عربی مدارس کے ان فارغ التحصیل طلبہ کے لیے ایک خاص کلاس کھولدیں جس میں ان کو کم سے کم وقت میں زائد سے زائد علوم جدیدہ کی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملے۔ ایسے طلبہ کے لیے وظائف کا انتظام بھی ممکن ہے مگر ابتداءً وظائف اُن کو اس شرط پر دئے جاویں کہ وہ بعد فراغت کے عربی مدارس میں درس و تدریس کا کام اپنے ذمہ لیں گے۔ نیز یہ کہ نئی تعلیم کے مسلم اداروں کی دینی تعلیم بھی آئندہ انہیں لوگوں کے سپرد کی جائیگی۔

میرے نزدیک یہ تجویز کوئی ناقابل عمل تجویز نہیں ہے۔ اگر فریقین کے ارباب حل و عقد ایک جگہ بیٹھکر اس تجویز کو عملی جامہ پہنانا چاہیں تو بہت آسانی کے ساتھ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ مگر غالباً یہ سوال ہوگا کہ اس کی ابتدا کون فریق کرے؟ پس اگر علمائے نئی تعلیم کے ان مسلم اداروں کو اس قابل سمجھتے ہوں کہ ان کے یہاں کے فارغ التحصیل طلبا ان اداروں میں جاکر نئی تعلیم حاصل کریں تو اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی تحریک نئے تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے۔

مغربی تعلیم کے ساتھ نئے تعلیمیافتہ گروہ کا جو نقشہ مولنا نے کھینچا ہے اور جس کا کچھ نمونہ میںنے اقتباسات متذکرۂ بالا میں پیش کیا ہے اُس کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ ہم میں نقائص بھی ہیں، ہم میں خامیاں بھی ہیں، ہم میں سے بعض کے دلوں میں عقائد مذہبی کی طرف سے شکوک اور شبہات بھی ہیں، ہم میں سے جب ارکان اور احکام مذہبی کی پابندی بھی کماحقہٗ نہیں ہوتی ہے جس کی بابت ہم سخت ملامت کے مستوجب ہیں، مگر نئے تعلیمیافتہ گروہ کی جو تصویر مولنا نے کھینچی ہے وہ بہت ہی زیادہ بری اور سیاہ ہے، ہم تو بڑے ہیں مگر غالباً اس قدر بڑے نہیں جس قدر کہ ظاہر کئے جاتے ہیں اور اگر بڑے بھی ہیں تب بھی آخر سگ تو اسی در کے کہلاتے ہیں، جن خامیوں اور برائیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ نئے تعلیمیافتہ گروہ میں سب کی سب موجود سہی مگر ان کے ساتھ ہی غالباً کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو ایک حد تک ان برائیوں کی تلافی کرتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ ابھی تک قبر پرستی، پیر پرستی، اور شخصیت پرستی کے امراض سے پاک ہیں، اسی طرح وہ ابھی تک مختلف مذہبی گروہوں میں منقسم نہیں ہیں جو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوں۔ اور جن میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل تقریب قریب ناممکن ہو جیسا کہ علماء نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ان میں بدعتی اور وہابی کی کوئی تقسیم نہیں ہے، نہ ان میں کا کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔

مغربی تہذیب میں برائیاں بھی ہیں اور بھلائیاں بھی یہ ہماری اہمیت ہے کہ خُذ مَا صَفَا

وَدَعْ مَا كَدِرَ کے زرین اصول پر عمل کر کے ہم بھلائیاں اختیار کریں اور برائیوں سے پرہیز کریں۔
نئی تعلیم کے بارہ میں ہمارے اور علماء کے نقطۂ نظر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ نئی تعلیم اور جدید سائنٹفک انکشافات ہمکو جو کچھ بھی سکھاتے ہیں ان کا علم حاصل کرنے کے باوجود ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور علماء کا گروہ انکشافات جدیدہ اور جدید سائنس سے مسلمانوں کو ناواقف اور جاہل رکھکر ان کو مسلمان رکھنا چاہتا ہے۔

ہم پر اہل مغرب کے تتبع کا الزام لگایا جاتا ہے مگر فی الحقیقت ہم اہل مغرب کا تتبع نہیں کرتے ہیں بلکہ جو قرضہ آزادی رائے، تفقہ فی الدین، شخصیت پرستی سے اجتناب، محنت اور عمل کی قدر کا آج سے صدیوں پہلے ہم نے اہل مغرب کو دیا تھا اور جس کی مدد سے اہل مغرب نے کلیسائے روم پاپائے اعظم اور نا اہل پیشوایان دین کے ظلم و استبداد سے نجات پائی تھی وہ قرضہ مع سود کے اہل مغرب سے ہم وصول کرنا چاہتے ہیں غرض جو سبق آزادی رائے اور تفقہ فی الدین کا ہمنے اہل مغرب کو سکھایا تھا وہی سبق اب ہم ان سے سیکھنا چاہتے ہیں اور علوم و فنون کی جو امانت ہم نے ان کے سپرد کی تھی اس کو اب ہم ان سے واپس لینا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری کھری اور قیمتی امانت کے ساتھ اہل مغرب ہمکو بہت سے تباہ کن اور مضرت رساں مزخرفات مثلاً شراب خواری، قماربازی وغیرہ بھی واپس کرنا چاہتے ہیں اور ہم میں سے بعض ناسمجھ بجائے اپنی اصلی امانت واپس لینے کے ان مزخرفات کو اُن سے لے کر خود اپنے آپ کو اور اسلام کو نقصان پہونچاتے ہیں، پس ہماری کوشش یہی ہونا چاہیے کہ ہم اپنی اصلی امانت واپس لیں اور ان خرافات سے پرہیز کریں۔

ہم پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم اہل مغرب کی ایک ایک ادا پر جان دیتے ہیں۔ اس کی بابت صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگرچہ بعض ظاہری باتوں میں ہم اہل مغرب کا تشبہ ضرور کرتے ہیں مگر نئے تعلیمیافتہ گروہ کے دل میں اہل فرنگ سے جو منافرت اور مغائرت ہے وہ اس سے

زیادہ ہے جو پرانے تعلیمیافتہ گروہ کے بزرگوں کو ہے کیونکہ نئے تعلیمیافتہ گروہ کو اس بات کا علم کہ اہل فرنگ نے ایشیا والوں کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً وقتاً فوقتاً کیا کیا زیادتیاں کی ہیں زیادہ تفصیلی طور پر پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ چنانچہ جب کبھی اہل فرنگ نے مصر، طرابلس یا ٹرکی میں مسلمانوں پر مظالم کیے تو نئے تعلیمیافتہ گروہ ہی نے ابتداءً اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بعض بعض صورتوں میں ٹرکی اور قسطنطنیہ کو مشن بھیج کر عملی امداد بھی کی اگرچہ یہ امداد بہت ہی تھوڑی ہو اسی طرح ہندوستان میں جو جنگ آزادی چھڑی اس میں نئے تعلیمیافتہ گروہ ہی نے غالباً زیادہ حصہ لیا۔ پس ان واقعات کے باوجود بھی اس الزام پر اصرار کیا جاوے کہ نیا تعلیمیافتہ گروہ اہل مغرب کی ہر ادا پر جان دیتا ہے تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا عرض کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے پرانے تعلیمیافتہ بزرگ اپنے قیاس کو ہمارے بیان پر ترجیح دیتے ہیں جو حصول علم کا یقیناً صحیح طریقہ نہیں ہے۔

بہرحال اس بحث کے متعلق میں کچھ اور عرض کرنا نہیں چاہتا اگر بغور دیکھا جائے تو نئے تعلیمیافتہ اور پرانے تعلیمیافتہ اصحاب کی مجموعی تعداد بھی مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں بمنزلہ آٹے میں نمک کے ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا دار و مدار زیادہ تر کاشتکاروں اور مزدوروں کے اُس بے زبان طبقہ کے ہاتھ میں ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی اور جو مسلمانوں کی کل آبادی کا ۹/۱۰ حصہ سے زائد ہے اس لیے ہمارا فرض ہے (خواہ ہم نئی تعلیمیافتہ جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا پرانی تعلیم کے حامی ہوں) کہ ہم اس طبقہ کی اصلاح کریں، اس طبقہ میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادہ پیدا کریں اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لیے استعمال کریں، اگر ایسا کرنے میں ہم کامیاب ہوگئے تو سمجھ لیجیے کہ ہم نے بڑی حد تک سیاسی جنگ جیت لی (۶)

مولینا ممدوح فرماتے ہیں کہ ''مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے، ہم دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے ہمارے حقوق پر آنچ نہ آنے پا دے'' لیکن مولینا کے خیال کے مطابق چونکہ ان کی آئینی ضمانتوں کے پیچھے کوئی (Sanction) یا ایسی قوت موجود نہ ہوگی جو اکثریت کو ان ضمانتوں پر قائم رہنے کے لیے مجبور کرے اس لیے یہ ضمانتیں بیکار رہوں گی مولینا کا یہ خیال بالکل صحیح ہے مگر آئینی ضمانتوں کے بجائے مولانا کی جو اپنی تجویز ہے اس پر بھی بعینہٖ یہی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ مولینا کی تجویز ہے کہ ۔

''مسلمانوں کی حیات قومی برقرار رکھنے کے لیے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں سلطنت کے اندر سلطنت کہا جاتا ہے' ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جبتک کہ خود ان کی جماعت میں کوئی قوت ضابطہ اور ہیئت حاکمہ موجود نہ ہو......''

فرض کیجیے کہ اکثریت پارٹی مسلمانوں کو ''سلطنت در سلطنت'' دینے پر رضامند بھی ہو گئی' اور مسلمانوں کی سلطنت در سلطنت باہمی میثاق کی رو سے قائم بھی ہو گئی' اور ان کو اپنی سلطنت در سلطنت میں حدود شرعیہ کے جاری کرنے کا حق حاصل بھی ہو گیا لیکن با ایں ہمہ مسلمانوں کے پاس کونسی وہ قوت ہو گی جو مسلمانوں کی اس سلطنت در سلطنت کے احکام کا اکثریت پارٹی کی رائے کے خلاف نفاذ کرا سکے؟ مثلاً اکثریت پارٹی فرض کیجیے کہ یہ قانون پاس کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی ایک قلم بند کر دی جاوے تو مسلمانوں کی یہ سلطنت در سلطنت اکثریت پارٹی کے نفاذ کو کیسے روک سکتی ہے؟

اسی طرح مسلمانوں کی یہ مفروضہ ''سلطنت در سلطنت'' اپنے یہاں حدود شرعی جاری کرنا

چاہتی ہے۔ پس فرض کرو کہ کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو جائے اور حد شرعی کے مطابق اس کو قتل کر دیا جائے تو اکثریت پارٹی اس کی کیسے اجازت دے سکتی ہے؟ خصوصاً جبکہ مسلمان اپنے اس واجبی حق کے قائم رکھنے پر بجا طور پر اصرار کریں گے کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیں۔ اسی طرح مسلمان اگر اپنی سلطنت در سلطنت میں زنا کی حد سنگساری کو جاری کرنا چاہیں اور کوئی مسلمان کسی غیر مسلم عورت سے زنا کا مرتکب ہو۔ یا کوئی غیر مسلم کسی مسلمان عورت سے زنا کا مرتکب ہو تو مسلمانوں کی یہ سلطنت در سلطنت مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر تو زنا کی حد جاری کر دے گی لیکن کیا اس غیر مسلم مرد اور غیر مسلم عورت کو بلا کسی بازپرس اور سزا کے چھوڑ دے گی؟ (۷)

مولانا نے ایک لفظ "شبہ دار الاسلام" کا بہت ہی اچھا ایجاد کیا ہے۔ مولانا کی خواہش ہے کہ اگر ہم مسلمان دار الاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دار الاسلام قائم کرنے کی ضرور کوشش کریں۔ مگر میرا خیال ہے کہ جو نظام حکومت اس وقت قائم ہے، یا آئندہ "سلطنت در سلطنت" یا آئینی ضمانتوں کے ماتحت ہو وہ بھی شبہ دار الاسلام ضرور ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام حکومت دار الاسلام نہیں ہے اور دار الحرب بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے علماء دار الحرب کے احکام موجودہ نظام حکومت سے متعلق نہیں کرتے اس لیئے جبکہ یہ نظام حکومت نہ دار الاسلام ہوا اور نہ دار الحرب تو ان دونوں کے بین بین کوئی چیز ہوا اور اس کو شبہ دار الاسلام ہی سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر کی چند مثالوں سے واضح کیا ہے کہ ہم اس شبہ دار الاسلام میں کل اسلامی حدود جاری نہیں کر سکتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس شبہ دار الاسلام میں مسلم اور غیر مسلم کے مقدمات اور معاملات کے لیے تفقہ فی الدین کر کے کچھ خاص احکام نافذ کر سکیں تاکہ مسلمانوں کو اغیار کی اس اقتصادی غلامی سے نجات ملے جس میں کہ وہ آجکل مبتلا ہیں۔ (۸)۔

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مگر جیسا کہ میں نے اوپر واضح کرنے کی کوشش کی ہے مسلمانوں کے حقوق کو بحیثیت ایک اقلیت کے اُن کی "سلطنت در سلطنت" اس سے زیادہ محفوظ نہیں کر سکتی جتنا کہ آئینی ضمانتیں، اور اکثریت پارٹی کا آئینی ضمانتوں کو منظور کرنے پر رضامند ہو جانا بہ نسبت "سلطنت در سلطنت" کی تجویز کے زیادہ آسان ہے۔ (۹)

نیز مولانا ممدوح کی "سلطنت در سلطنت" والی تجویز کے سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اگر یہ سلطنت در سلطنت والی تجویز غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے لیے منظور کرلے (۱۰) اور اسی کے ساتھ ہند و اکثریت عیسائی، اور سکھ اقلیتوں کے واسطے بھی اس کو ضروری خیال کرے تو ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ کم از کم چار "سلطنت در سلطنتیں" ہوں گی (۱۱) اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کی آیندہ حکومت کے لیے کونسا نظام بہتر اور قابل العمل ہے؟ یعنی۔

(۱) وہ نظام حکومت جس میں ایک سے زیادہ سلطنت در سلطنتیں موجود ہوں۔

(۲) یا وہ نظام جس میں حکومت کو اپنے افراد کے مذہب سے کوئی سروکار نہ ہو اور اُس حکومت کے افراد کا ہر فرقہ اور ہر گروہ اپنی زبان اور پرسنل لا کے متعلق آزاد ہو۔

پہلے طریقۂ حکومت میں ہر گروہ کی طرف سے جو لوگ برسرِ اقتدار ہوں گے سو غالباً وہ ہوں گے جنمیں رواداری کم ہوگی اور ایک دوسرے گروہ سے تنازع اور تصادم پیدا کرنیکا جذبہ زیادہ ہوگا۔

دوسرے طریقۂ حکومت کو اگر ہر فریق نیک نیتی سے چلانے کی کوشش کریگا تو غالباً وہ زیادہ سہولت سے چل سکے گا، بہرحال ہم مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم ان میں سے کونسا طریقہ اختیار کریں؟ مگر جو بھی کچھ کرنا ہو فوراً کرنا چاہیے۔ اب ایک لمحہ کے انتظار کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ دوسرا طریقہ کار اکثریت پارٹی کی صرف آئینی ضمانتوں اور میثاقوں

پر ہی مبنی ہوگا۔ رہا آئینی ضمانتوں اور میثاقوں کا اکثریت پارٹی کی طرف سے ایفا سو یہ مسلمانوں کی رائے عامہ اُن کی یکجہتی اور اتفاق، اور ان کے اپنے واجبی حقوق کی خاطر جان دینے کے لیے تیار رہنے کے جذبہ پر منحصر ہے۔

مسلمان چار صوبوں یعنی پنجاب، سرحد، سندھ، اور بنگال میں اس وقت اکثریت رکھتے ہیں اور چونکہ مسلمانوں کی آبادی غیر مسلم اقوام کی بہ نسبت زیادہ بڑھتی ہے اور اس لیے اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ ان چار صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جاوگی بلکہ ان کی اکثریت غالباً آئندہ اور زیادہ ہو جاوے گی پس اگر ان چار صوبوں میں مسلمان اپنی اکثریت کی بنا پر اپنے حقوق کی حفاظت کریں گے اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کو ناجائز طور پر پامال کرنے کی کوشش نہ کریں گے تو اغلب یہ ہے کہ اُن صوبوں کی اکثریتیں بھی جن میں مسلمان اقلیت کی حالت میں ہیں مسلمانوں کے حقوق کو بیجا طور پر پامال کرنے کی کوشش نہ کرینگی اگر رواداری کی بنا پر نہیں تو کم از کم مصلحت کی بنا پر ہی۔

ایک سوال البتہ رہ جاتا ہے کہ اگرچہ مسلمان چار صوبوں میں اکثریت کی حالت میں ہیں مگر (Centre) یا مرکزی حکومت میں اب بھی اقلیت کی حالت میں ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے پس اگر مرکزی حکومت ایسے قوانین جاری اور نافذ کرنا چاہے جن سے مسلمانوں کے جائز حقوق پامال ہوتے ہوں تو مسلمانوں کے پاس اس کے دفاع کا کوئی ذریعہ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ ایسی کارروائی کے خلاف اپنی متفقہ آواز بلند کریں اور اگر مسلمانوں کی سات کروڑ کی آبادی اپنے واجبی حقوق کے لیے، اپنی متفقہ آواز بلند کرے تو کوئی مرکزی حکومت اگرچہ وہ کیسی ہی متعصب ہو مشکل سے مسلمانوں کے ایسے متفقہ احتجاج کو نظر انداز کر سکیگی، لیکن اگر مسلمانوں کے ایسے متفقہ احتجاج کے باوجود کوئی ناعاقبت اندیش مرکزی گورنمنٹ مسلمانوں کے واجبی حقوق کے پامال کرنے پر آمادہ ہی

ہو جاوے تو اس صورت میں مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ وہ بین الملکی جنگ کے لیے تیار رہیں۔

لیکن یہ سب آئینی ضمانتیں اور مواثیق اسی وقت ہمارے کام آسکتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی سات کروڑ آبادی اپنے حقوق کو سمجھے اور ان کی حفاظت کے لیے تن، من اور دھن سے آمادہ ہو جائے۔

(۱۲) اب یہ کام تعلیم یافتہ طبقہ کا ہے (چاہے ہم پرانی تعلیم کے حامی ہوں یا نئی تعلیم کے مؤید یا دونوں کے) کہ ہم عوام میں جائیں، ان کی حالت کے سدھارنے کی کوشش کریں، غرض ہر طرح سے ان کے کام آویں، ان میں عمومی تعلیم جاری کریں، ان کو ان کے حقوق سے آگاہ کریں، اپنی بیجا رعونت کو نکال ڈالیں اور اسلام کے زرین اصول کل مومن اخوۃ پر کاربند ہوں۔

پس اگر ہم اپنے کاشتکار، دستکار، پیشہ ور اور مزدور بھائیوں میں جا کر اُن کی خدمت اور ان کی تنظیم کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو متحدہ عزم اور ارادہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے لوگوں نے ہندو قوم میں پیدا کر دیا ہے وہ ہم مسلمان اپنے سات کروڑ مسلمان بھائیوں میں پیدا نہ کر سکیں (۱۳) مگر یہ جب ہی ہو سکے گا کہ جب ہم میں کے سربرآوردہ افراد خواہ وہ مسٹر جناح ہوں یا نواب چھتاری، مولانا حسین احمد صاحب مدنی ہوں یا مفتی کفایت اللہ صاحب دیہات میں جا دیں، کاشتکاروں کی ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر بیٹھیں، ان کو یہ محسوس کرا دیں کہ یہ بڑے بڑے لوگ ان کے بھائی ہیں، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ ان کی بھلائی اور بہتری کے واسطے ہی کر رہے ہیں، بس صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے موجودہ سیاسی جنگ میں مسلمان اپنے وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں، اسلام اور شعائر اسلام کو ہندوستان میں تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس موجودہ جنگ میں ہم مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام سے خواہ مخواہ معاندانہ اور مخالفانہ طریقہ کار اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے،

اگر ان میں کا کوئی طبقہ رواداری پر آمادہ ہو تو ہم کو بھی پورے طور پر رواداری کے لیے تیار رہنا چاہیے تاکہ مسلم اور غیر مسلم اقوام مذہبی امور کے علاوہ باقی جملہ سیاسی امور میں متحد اور متفق ہو کر ملک اور اہل ملک کی بہبودی اور ترقی کے کاموں میں مصروف رہ سکیں (۱۴)۔

ملاحظات

از ایڈیٹر

میں نے ترجمان القرآن کی سابق اشاعتوں میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسے میری قدرت بیان کا نقص سمجھیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے میں اپنا نقطۂ نظر پوری طرح واضح نہ کر سکا اور اس کے متعلق فاضل مضمون نگار جیسے اعلیٰ تعلیمیافتہ اور فہیم و ذکی اصحاب کو بھی شبہات پیش آئے تاہم اب میں دوبارہ کوشش کروں گا کہ حالات کو جس نظر سے میں دیکھتا ہوں اسی نظر سے دوسروں کو دکھا سکوں اور مستقبل کے متعلق جس رائے کو میں درست سمجھتا ہوں اس کے درست ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہنے دوں۔ بحث کی تسہیل کے لیے میں نے نواب صاحب کے مضمون میں قابل جواب امور پر نمبر لگا دیے ہیں، اور اب نمبروار جواب عرض کرتا ہوں۔

(۱) فاضل مضمون نگار ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں، وہ "بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسئلہ کو محض اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ تدابیر "بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں" اور اُن کے حصول میں صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو اُن وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے

جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ قوتِ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو روبکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف نواب صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوتِ فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجیے اور ایک ایک جزو کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجیے کہ آیا آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

۱۔ میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں ——— یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلہ پر دو بالکل مختلف و متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی مذکور الصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے، اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے میں اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں، اس لیے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)۔

۲۔ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو، اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقا کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ——— میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے۔

۳۔ مذکورۂ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں، اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں، تب بھی وہ اس توازن اور توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورۂ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے؟ اصول اسلام کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟ پس ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور موثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ——— کیا آپ (اور "آپ" سے میری مراد وہ سب لوگ ہیں جنھیں میرے سیاسی مسلک سے اختلاف ہے) اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں۔ اگر تسلیم ہے تو یہ فرمائیے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یا اُسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب، اور نہ حاصل ہو تو کچھ پروا نہیں، اس کے بغیر ہی آگے بڑھے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو موثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان

کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کرسکیں۔ اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لیے یکساں مہلک ہیں ــــ آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بد پیدا نہیں ہوسکتے جن کے خطرات میں نے ظاہر کیے ہیں؟ کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حب وطن یا حب نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کرنا چاہیے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵۔ وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک ان تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہوسکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے ــــ اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے، تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان تدابیر کا جائزہ لیجیے اور غور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کونسی تدبیریں ہوسکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کرکے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لیے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"، بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہرحال انہیں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً

یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظام اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شائد صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے، لہٰذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لیے صدر اول کے مسلمانوں کی سی انتہائی دینداری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کے لیے اجتماعی جد وجہد کر سکتی ہو، جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کر دے، اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرہ میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے، نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبہ کے ساتھ اس کام کے لیے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے، تو ایک قلیل مدت ہی میں ایسی ایک رائے عام تیار کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں۔ صحیح طریق کار کی دشواریوں کو دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کیے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر

خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہوگئی ہے اور ہم اس درجۂ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لیے کوئی اجتماعی جد و جہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

۲۔ یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی ہو جائیگی یا ہوجانی چاہیے جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہولیں پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریک جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرلیں جو شریک جنگ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انھیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک بنیان مرصوص بننے کی ضرورت ہے۔ لیکن صاحب مضمون کو نہ معلوم میرے کونسے الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص نہیں بنانا چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور اس کے لیے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ہم کو نصب العین اور طریق کار

دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملالیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خودسری یا منافقت کی بنا پر اپنی قوم کا ساتھ دینے سے انکار کریں عام اس سے کہ وہ نئے تعلیمافتہ ہوں یا پرانے تعلیمافتہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص نہیں بنایا جاسکتا۔

اس کے ساتھ ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور کرنا ضروری ہے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کردیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ ہتیاروں پر صیقل بھی ہوگا، اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بڑھتا چلا جائے گا اور اس کے اثرات وہی ہوں گے جو فاضل مضمون نگار کو مطلوب ہیں بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کرلیے ہیں، اور فلاں گروہ اتنا طاقتور ہوچکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ ان کی شکست خوردگی کا ثبوت ہوگا۔

۴۔ مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدت ملّی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع، ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جارہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ

مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیر حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہوگیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے ان کے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدہ اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظام تہذیب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ نسل اور رمز بوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لیے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرز معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے ان کی "ہندویت" بہرحال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لاسکے۔ لہٰذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات ان کے لیے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں، یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کرسکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشو و نما ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی، اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا۔ جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اٹھانے کی موجب ہوئی، مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کردیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کرلیے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑ گیا

چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سمجھے بوجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مسلمانوں پر مغربی استیلاء کے اثرات اُس کے بالکل برعکس ہوئے ہیں جو آپ کو ہندوؤں میں نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا، اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن، اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہونچایا وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ من جملہ دوسرے اسباب زوال کے، ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ خیال کیا ہے کہ میں پرانے تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتا ہوں اور اس گروہ کی جانب سے جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کر رہا ہوں اس لیے میری تحریروں سے ان دونوں گروہوں میں جو اختلافات ہیں وہ اور زیادہ بڑھ جائیں گے، اور تعلیم جدید کے خلاف مسلمانوں کے جذبات میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا تعلق ان دونوں گروہوں میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جدید تعلیم و تربیت کے نقائص پر جس قدر صاف گوئی کے ساتھ تنقید کی ہے، اسی قدر صاف گوئی کے ساتھ قدیم تعلیم کی کمزوریوں اور پرانے تعلیم یافتہ حضرات کی غلطیوں

بھی متعدد مرتبہ تنقید کرچکا ہوں میں ان دونوں گروہوں میں تنافر نہیں بلکہ مصالحت چاہتا ہوں اور مصالحت کی صورت میرے نزدیک یہی ہے کہ ایک گروہ اپنی قدامت پرستی اور جمود کو چھوڑے اور دوسرا گروہ اہل مغرب کی اندھی تقلید سے باز آئے۔

---

(۵) "علوم جدیدہ" اور "جدید تعلیم" کے فرق کو نظر انداز نہ کیجیے۔ میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا مخالف نہیں بلکہ شدت کے ساتھ حامی ہوں، اور بارہا اس رائے کا اظہار کرچکا ہوں کہ مسلمانوں کے تنزل کا ایک بڑا سبب ان کا جمود اور ماضی پرستی میں مبتلا ہوجانا اور تحقیق و اجتہاد کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جانا ہے لیکن زمین اور آسمان کا فرق ہے "علوم جدیدہ کی تعلیم" اور اس "جدید تعلیم" میں جو ہمارے نوجوانوں کو دی جارہی ہے۔ حقائق فطرت کے انکشافات، اور آثار فطرت کے مشاہدات اور مسائل عمرانیہ میں فکر انسانی کے اجتہادات فی نفسہٖ اسلام کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ مسلمان کو مسلمان بنانے میں اور زیادہ مدد دیتے ہیں، اور اس کی ترقی کے لیے ان کی حیثیت "ناگزیر وسائل" کی ہے۔ لیکن جو چیز ان تمام علوم کو اسلام کے خلاف بنا دیتی ہے، اور مسلمان کو کفر و فسق کی طرف لے جاتی ہے وہ، وہ خاص مغربی نقطۂ نظر ہے جو ان تمام علوم کی بنیاد بن گیا ہے، اور وہ خاص طرز تعلیم و تربیت ہے جو ہماری درسگاہوں میں رائج ہے۔ اس مسئلہ پر ترجمان القرآن کی متعدد اشاعتوں میں تفصیل کے ساتھ بحث کی جاچکی ہے۔ اگر فاضل مضمون نگار ان مضامین کو ملاحظہ فرمالیں تو ان کے اکثر شبہات خود دور ہوجائیں گے (خصوصیت کے ساتھ جمادی الاخریٰ، رجب و ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ، رجب ۱۳۵۴ھ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ کے "اشارات" اور جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ کی اشاعت میں وہ مضمون جو علیگڑھ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم پر لکھا گیا ہے، قابل ملاحظہ ہے)۔

---

(۶) درحقیقت یہی کام میرے پیش نظر ہے جس کی طرف نواب صاحب نے اشارہ فرمایا ہے چند صفحات قبل میرے جس پروگرام کو نواب صاحب ناقابل عمل قرار دے چکے ہیں اس کا اہم ترین حصہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے طبقۂ عوام میں اسلام کا کم سے کم ضروری علم پہونچا دیا جائے تاکہ وہ اپنے دین سے واقف ہوجائیں اور ان رسوم جاہلیت سے خود بخود اجتناب کرنے لگیں جو ان کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے اندر قومی مفاد کا صحیح شعور پیدا کیا جائے، اور ان کو کم ازکم اس حد تک باخبر کردیا جائے کہ وہ قومی مفاد کی خدمت کرنے والوں اور اسے نقصان پہنچانے والوں کے درمیان امتیاز کرسکیں۔

---

(۷) "سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدود اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اس نظام کی مضبوطی اور اس کے حامیوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گنی زیادہ اکثریت پر حکمراں ہیں۔ ایک ڈیماکریٹک نظام حکومت میں بھی اقتدار اکثریت (Majority Rule) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر کم اثر بنا سکتی ہے پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو میں تجویز کر رہا ہوں، کن حدود تک وسیع ہوگی، اس حالت میں طے نہیں ہوسکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیے پھر ہم جتنی طاقت فراہم کرلیں گے اسی کی نسبت سے "سلطنت در سلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہونگے۔

---

(۸) "شبہ دار الاسلام" سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص "دار الکفر" کی بہ نسبت

خالص ”دارالاسلام“ سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے، جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں، جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں۔ اُن کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں لیکن اس محدود آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بلاواسطہ اثر سے محفوظ نہیں رہتے انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ اُن مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے، جن کی بجا آوری میں ہم آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظامِ معیشت قائم کیا ہے اُس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی اصولِ معیشت کی پابندی قریب قریب محال ہو گئی ہے اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو ان اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظامِ عدل و قانون اور ان کا آئینِ حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلاواسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدارِ مطلق فی نفسہٖ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔ جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہے، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دارالکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لیے اسے شبہ دارالکفر، کہنا

چاہیے نہ کہ شبہ دارالاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رہنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں، وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے، اس وقت ہم نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل متعین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کرسکتے ہیں۔ جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائیگی اور پوری طرح مستحکم ہو جائیگی اس وقت ہمارے لیے اپنا اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دارالکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اس کی گرفت میں جکڑ گئے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لیے اس کی بندشوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر جانے دیا، اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کرسکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دارالکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دارالکفر لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں محض عقل عام **Common Sense** رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لیے بھی دلائل کی ضرورت پیش آرہی ہے، اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اس لیے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ان کا ضمیر تو پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دارالکفر ہو یا خالص دارالکفر ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہیے
جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں لیکن جو لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ
ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

---

(۹) اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کے بعد مجھے امید ہے کہ فاضل مضمون نگار اپنی
اس رائے پر خود نظر ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں، اور ان پر اکثریت کی رضامندی کوئی ایسی چیز نہیں
ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو، تو ان کا
قائم رہنا یا نہ رہنا بہرحال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان
کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے،
اور اس کے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں۔

---

(۱۰) اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا مدار ہو وہ اس نام سے موسوم
کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا
اور قائم رکھتا ہے خواہ کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

---

(۱۱) میں ربیع الاول ۵۶ھ کی اشاعت میں ان کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا
ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں "سلطنت در سلطنت"
سے میری مراد یہی حقوق اور اختیارات ہیں۔ آپ ایک مرتبہ پھر ان کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں کونسی
چیز ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے

روک سکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشوو ارتقا میں مانع ہو؟ اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لیے اس قسم کی خود اختیاری (Autonomy) طلب کریں تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں، اور ان سب کو ایسی خود اختیاری دینے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظام حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

---

(۱۲) یہ وہی چیز ہے جس کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں۔ اسی کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان کسی ایک نصب العین پر متحد ہوں، اپنے قومی مفاد کا ایک واضح اور متعین نقشہ ان کے درمیان متفق علیہ ہو، اور کوئی ایسا نظم ان کی جماعت میں پیدا ہو جائے جس کے تحت وہ اپنے مفاد کے لیے اجتماعی جدوجہد کر سکیں۔ یہی چیز اس وقت مفقود ہے، اور اسی کا فقدان ہماری آواز کو بے اثر بنا رہا ہے۔ اگر ہماری ایک جماعت کسی چیز کو قومی حق قرار دے کر اس کا مطالبہ کرے، اور خود ہماری اپنی قوم کی ایک دوسری جماعت اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم اپنے کسی حق کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اس وقت تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے تو دوسرے گروہ کا کچھ اور۔ ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق نہیں، اور تیسرا گروہ اس چیز کا نام ہی سن کر "کمیونلزم" کا آوازہ کس دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ہماری ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کے لیے اٹھتی ہے اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں سے بڑھ کر نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ اب اندازہ کیجیے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہونچانے والی ہو سکتی ہے۔ اور جب حال یہ ہے تو وہ متفقہ آواز آپ لائیں گے ہی کہاں سے جس کے بغیر آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ

کوئی آئینی ضمانت اور کوئی میثاق ہمارے لیے قابل اطمینان نہیں ہے۔

---

(۱۳) یہی کام ہے جس کو میں چاہتا ہوں کہ اسلامی اصول پر انجام دیا جائے۔ چونکہ ہمارے سامنے صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے، اس لیے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں ہمارے لیے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابل اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کیے گئے تھے۔ وہ صرف اسی زمانہ کے لیے نہ تھے، بلکہ تمام ازمنہ اور امکنہ کے لیے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں، اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے، آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے، اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لیے صدیاں درکار ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے البتہ اس کے لیے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لا سکتی ہے جو سیرت محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفان میں بھی راہ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لیے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور ایسے خدا کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور ہوائے نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک

ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

---

(۴) اس کے متعلق میں تصریح کر چکا ہوں۔ جمہور اہل اسلام کی قیادت اب ان لوگوں سے چھین لینی چاہیے جو چھوٹے چھوٹے مسائل پر مسلمانوں کو بھڑکا کر ہمسایہ قوموں سے لڑا دیتے ہیں، اور قوم کی قوت کو فضول جھگڑوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اب قیادت و رہنمائی کے لیے ایک ایسی ترقی پسند مسلمان جماعت کو اٹھنا چاہیے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ کھلے دل سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو، اور ان معاملات میں کسی قسم کا فرقہ وارانہ تعصب روا نہ رکھے، مگر اپنے قومی مفاد کے معاملہ میں (جس کے حدود واضح طور پر مشترک وطنی معاملات سے الگ ہوں) کسی دباؤ، کسی لالچ، کسی پروپیگنڈا کی طاقت سے اس کو مغلوبانہ مصالحت کے لیے راضی نہ کیا جا سکتا ہو۔

رسائل و مسائل

خطبۂ جمعہ کی زبان

نظام آباد سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

خطبۂ جمعہ کی زبان کے مسئلہ پر جناب نے جو نقلاً و عقلاً روشنی ڈالی ہے اور حالات زمانہ کے لحاظ سے جو نتائج اخذ فرمائے ہیں اس حد تک تو مجال اختلاف نہیں۔ سچ ہے کہ عربی زبان تو درکنار مسلمان اپنی ابتدائی دینی تعلیم بھی لازمی نہیں کرا سکتے تو خطبۂ عربیہ کا حکم کیا معنی مجبور کے لیے تو حرام کھانے کی بھی اجازت ہے لیکن اس تحقیق میں جناب نے جو اصولی بحث چھیڑ دی ہے وہ محل نظر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کو مصلحت شرعی کے بجائے ایک طبعی فعل قرار دینے پر جو دلائل اور وجوہ جناب نے تحریر فرمائے ہیں وہ قلب کو مطمئن نہیں کرتے۔ بلا شبہ اسلام کو وطنی اور لسانی عصبیت سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ آیا ہی اس لیے ہے کہ گروہ انسانی میں ملکی و نسلی اور لسانی جو غلط تخیلات بنار تفریق و تقسیم ہیں ان کو مٹا کر مختلف اقوام کی جگہ ایک قومیت کی تعمیر کی جائے۔ اس قومیت کا نام اسلام ہے - اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳ : ۲) اور قوم کا نام مسلم رکھا گیا هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (۲۲ - ۱۰) جس طرح دنیا میں مختلف قومیں آباد ہوئیں اور ہیں اور ہر قوم کی ایک زبان رہی ہے تو فطرۃً اس قوم "مسلم" کی بھی کوئی ایک زبان ہونی چاہیے۔ جو نتائج فطرۃً و لازماً پیدا ہوتے ہیں ان کو حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا حکیم یہ نہیں کہیگا کہ تم مرض کو دفع کرو بلکہ ان ہدایتوں پر عمل کرائیگا جن پر عمل کرنے کا نتیجہ صحت ہے۔ حاکم قوم محکوم کی زبان کو بدلدینے کا حکم نہیں دیتی۔ فطرۃً محکوم حاکم قوم کی زبان اختیار کرینگے۔ پھر خالقِ فطرت ایسا حکم کیوں دیتا اور خالقِ فطرت کا رسول ایسی ہدایت

کیوں دے جس کا ظہور بطور نتیجہ لازمی ہوتا۔ نزولِ قرآن کا مقصد یہی ہے کہ گروہ انسانی میں حکومتِ الٰہیہ قائم کی جائے۔ حکومت کی زبان عربی ہے حکومت کے کاروبار انجام دینے والوں کی زبان اس کے محکوم کی زبان لازماً وہی ہوگی۔ قرآن عربی ہونے کے متعلق جو آیتیں ہیں وہ ملاحظہ ہوں:۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ (۱۲:۲) — ہم نے اس قرآن کو عربی میں اتارا ہے تاکہ تم بخوبی سمجھ سکو

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا۔ (۱۹:۶) — ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا تاکہ تو اس کے ذریعہ سے پرہیزگاروں کو بشارت دے اور اکھڑ لوگوں کو عذاب سے ڈرائے

وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا الخ (۲۰:۶) — اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن اتارا ہے۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (۳۹:۳) — قرآن عربی جس میں کوئی پیچیدگی نہیں تاکہ لوگ سمجھ کر خدا سے ڈریں

قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔ (۴۱:۱) — قرآن عربی ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔

اگر ان آیتوں کا صرف یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ عرب تھے دعوتِ اسلام ابتداءً اہلِ عرب کو دی گئی اس لیے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تو یہ ایسی کیا "حکمت" کی بات تھی جو ایک "حکیم" نے بتائی یہ نہ بھی بتایا جاتا تو بھی یہی سمجھا جاتا۔ قرآن اور رسول اللہ اہلِ عرب ہی کے لیے نہیں تھے تو پھر یہ کوئی قرینہ نہیں کہ ان آیتوں کے مخاطب تو اہلِ عرب تھے اور باقی آیتوں کے مخاطب تمام بنی آدم۔ اگر قرآن اپنے مخاطب کی زبان کے لحاظ سے عربی میں نازل ہوا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اکثر احکام بھی اہلِ عرب کے طبعی و ملکی حالات کے لحاظ سے نازل ہوئے۔ جیسا کہ بعض کج فہم کہتے ہیں۔ وہ قرآن جو..... تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ اور مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ہے۔ جو هُدًى لِّلنَّاسِ و ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ہے، کل بنی آدم کے لیے جس کو صراطِ مستقیم کہا جا رہا ہے پھر وہ بنی آدم جن میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں ان سب کے لیے قرآن عربی نازل کرنے میں کیا "حکمت" پنہاں ہے۔ وہ خدا جو اپنے رسول کو رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ کا مرتبہ دیکر "معلمِ کتاب و حکمت" بنا کر تمام بنی آدم

کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے کیا اس پر قادر نہ تھا کہ ایسے عظیم المرتبت رسول کو کل زبانوں سے واقف کرادے اگر احکم الحاکمین کا یہ مقصد نہ تھا کہ اس کا دین ایک ہی زبان جاننے والوں کا دین ہو کر رہ جائے؟

نبی کریم کا عربی زبان میں خطبہ دینا کسی شرعی مصلحت کا حامل نہیں تو غیر عربی زبان جاننے والوں کے لیے قرآن عربی نازل کرنا اور اس کی اشاعت کے لیے صرف عربی زبان جاننے والوں کو منتخب کرنا کیا نزول قرآن کے مقصد کو فوت نہیں کرتا؟ بلاشبہ رسول عربی کے مخاطب اہل عرب تھے مجلس نبوی کے حاضرین میں غیر زبان جاننے والوں کی تعداد کم رہتی تھی مگر نبی کریم نے جو دعوت نامے قیصر روم و شاہ ایران کو بھیجے تھے وہ کیوں عربی زبان میں بھیجے گئے؟ اگر مصلحت شرعی یہ نہیں ہے کہ دین کی اشاعت ایک ہی زبان میں ہو تو نبی کریم نے اس کو کیوں ملحوظ نہیں رکھا؟ وہ معلم۔ کتاب حکمت" کا کوئی فعل جس کا تعلق رسالت سے ہو خالی از حکمت نہ ہونا چاہیے۔ تمام دنیا کے لیے قرآن عربی نازل کرنا اسی حکمت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس دین سے جو قوم پیدا ہوگی اس کے افراد ایک ہی زبان بولنے والے ہوں۔ یہ بناء تفریق نہیں نتیجۂ وحدت ہے۔ خلاف فطرت نہیں عین فطرت ہے۔ دین الٰہی قائم ہوگا تو یہ مقصد خود بخود پورا ہو جائے گا۔ کسی قوم کو بھی لیجیے! افراد قوم کی ایک ہی زبان ہوگی! آج ہندوستان میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ہندوستانی قومیت کی تعمیر کے لیے وحدت زبان کی گتھی سلجھائی جا رہی ہے۔ دین اسلام اپنے متبعین میں رشتۂ اخوت قائم کرتا ہے۔ زبان کے اختلاف سے اجنبیت باقی رہے گی جو منافی اخوت ہے۔ ایک انگریز ایک ہندی ایک عرب ایک ترک ایک جاپانی ایک چینی یہ چھ مسلمان ایک جگہ جمع ہیں۔ آپس میں تبادلۂ خیالات تو کجا اسلامی طریقہ سے سلام بھی نہیں کر سکتے۔

ایک مقام پر آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اصلی اسلامی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ پر موقوف تھا۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ سیدنا عمر و سیدنا علی رضی اللہ عنہما میں اسی اسلامی اسپرٹ نے عربیت کا تعصب اور بھی زیادہ پیدا کر دیا۔ مولانا! غور مکرر کا محتاج ہے۔ وہ لوگ جن کی مثال دنیا م

اسلام آج تک نہ پیش کر سکی جو نور وہدایت علم وعمل سے آراستہ ہو کر عصبیتہ جاہلیت کو مٹانے کے لیے اٹھے تھے ان میں اسلام نے وہی عصبیت پیدا کر دی! حیرت کا مقام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصلی اسلامی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ پر موقوف تھا اس لیے عربیت کا تعصب نہیں بلکہ اسلام کی عصبیت عربی زبان کے تحفظ کی متقاضی تھی ورنہ جو استدلال جناب نے فرمایا ہے وہ تسلیم کر لیا جائے تو جہاد اسلامی کے متعلق یہ..... اعتراض کس قدر وزنی ہو جائے گا کہ چونکہ عرب پہلے سے قتل و غارت گری کے عادی تھے اسلام نے اس جذبہ کو ابھار دیا۔ گویا ان مقدس ہستیوں سے جو جان نثاریاں ہوئیں وہ دینی جذبہ نہیں تھا بلکہ ان کا عادی وطبعی فعل تھا۔ جس طرح عادی وطبعی فعل اور شرعی عمل کا امتیاز مشکل ہے اس سے زیادہ اس فعل کا تعین مشکل ہے جو عادی وطبعی بھی ہو اور مصلحت شرعی کا تقاضا بھی۔

صحابۂ کرام یا ائمۂ سلف نے اگر غیر عربی زبان میں خطبہ نہیں دیا یا عجمیوں کو دعوت اسلام نہیں دی یا غیر عربی زبان میں بات کرنا بھی مکروہ سمجھتے تھے تو وہ عادی وطبعی فعل یا حالات زمانی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کا نتیجہ تھا۔ دین الٰہی ان کے رگ وپے میں جاری وساری تھا۔ ان کی روح ان کے دل ودماغ احکام الٰہی کے تابع تھے۔ وہ حکومت الٰہیّہ کے سچے محکوم تھے جس طرح یہ حکومت ان کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب تھی اسی طرح حکومت کی زبان (جو عربوں کی نہیں بلکہ خدا کی حکومت تھی) اُن کو دوسری زبانوں سے زیادہ عزیز تھی۔ کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ آج جو لوگ حکومت کے شیدائی ہیں فرنگیت میں جذب ہو گئے ہیں ان کا اوڑھنا بچھونا انگریزی زبان ہے حالانکہ ملک معظم نے یا وائسرائے بہادر نے ان کو اپنی زبان بدل دینے کا کوئی حکم نہیں دیا۔

عصبیت لسانی کو مٹانے کا منشا، یہ ہے کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اسلام سے پہلے بھی جنہیں

یہ امتیاز تھی عجمی مسلمان ہونے کے بعد اسی طرح صاحب عزت و توقیر ہیں جیسے عرب اگر وہ عربی سے واقف نہیں تو ان کو کم تر نہ جانو۔ اسلامی قومیت میں جذب اور دین الٰہی میں شامل ہو جانے کے بعد ان کی زبان لازماً وہی ہو جائے گی جو حکومت کی زبان ہے کہ قوم مسلم در اصل حکومت الٰہی کی محکوم ہے۔

جس قوم کے ایمانیات و اعتقادات ایک جس کا مقصد حیات ایک جسکی زندگی کا نصب العین ایک ہو جسکی تعلیمات اخلاقیات معاملات عادات میں یکسانیت ہو اس قوم کی زبان ایک نہ ہونا دین مسلم کا مقصد نہیں! تعجب ہے! جس طرح اسلام سے پہلے کعبہ صرف عربوں کا تھا اسلام کے بعد وہ ہر مسلم کا کعبہ ہو گیا۔ اسی طرح اسلام سے پہلے عربی زبان صرف عربوں کی زبان تھی۔ اسلام کے بعد وہ زبان صرف عربوں کی نہیں رہی بلکہ قوم مسلم کی زبان ہے۔

ترجمان القرآن۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مراسلہ نگار نے مسئلہ زیر بحث پر اصولی طریقے سے غور نہیں کیا ہے، اسی وجہ سے ان کے کلام میں مختلف مباحث ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں یہ مسئلہ کا ایک پہلو فقہی ہے اور اس نقطۂ نظر سے صرف یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا خطبہ کو عربی زبان میں پڑھنا شرعاً ضروری ہے یا نہیں؟ اس سوال کے متعلق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے حسب ذیل امور کی تحقیق ہونی چاہیے: کیا خطبۂ عربیہ کے وجوب پر کوئی نص ہے؟ اگر نص نہیں ہے اور یہ حکم صرف شارع کے عمل سے ماخوذ ہے تو کیا شارع کا یہ عمل سنت کی تعریف میں آتا ہے؟ آیا اصطلاح شرع میں سنت ہر اس عمل کو کہتے ہیں جو شارع نے کیا ہو، یا اس باب میں شرعی عمل اور عادی و طبعی عمل میں کوئی فرق کیا گیا ہے؟ اگر فرق ہے تو شارع کا عربی میں خطبہ دینا کس قسم کا فعل ہے، شرعی یا طبعی؟ مسئلہ کا دوسرا پہلو مصالح سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے حسب ذیل امور کا تصفیہ ضروری ہے:۔ خطبہ کا مقصد کیا ہے؟ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شارع نے اور صدر اول کے

ائمہ نے جو طریق اختیار کیا تھا اس کی پابندی سے آج بھی وہ مقصد حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ اصول شریعت میں مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا وہ وسیلہ جو اس کو حاصل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو؟ اگر مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور کسی خاص صورت حال میں طریقۂ متوارثہ کی پابندی سے وہ فوت ہو رہا ہے اور اس صورت حال کو بدلنے پر ہم قادر نہیں ہیں تو کیا ہم اصول شرع کے تحت طریقۂ متوارثہ میں کوئی تغیر کر سکتے ہیں؟ اگر تغیر کرنے کا حق ہم کو حاصل ہے تو حالات کے لحاظ سے ہمیں کتنا اور کس طرح تغیر کرنا چاہیے؟

یہ ہیں وہ تنقیحات جن کے تصفیہ پر زبان خطبہ کے سوال کا حل منحصر ہے۔ اگر مراسلہ نگار نے ان تنقیحات کو پیش نظر رکھ کر بحث کی ہوتی تو ہم کو یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی کہ انہیں کن امور میں ہم سے اتفاق ہے اور کن امور میں اختلاف؟ پھر جو امور مختلف فیہ باقی رہ جاتے ان پر مزید بحث کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ لیکن جو طریق بحث انہوں نے اختیار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل امور تنقیح طلب ان کے سامنے واضح نہیں ہیں بلکہ وہ محض چند ضمنی مباحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال چونکہ وہ خطبہ کے مسئلہ میں مانعین تغیر کے عام خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، اس لیے ہم انکے مضمون کو شائع کر کے اختصار کے ساتھ ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو اور اسی طرز خیال کے دوسرے لوگوں کو اس مسئلہ میں الجھن پیش آتی ہے۔

صاحب مضمون نے زبان کے متعلق جو طریق استدلال اختیار کیا ہے وہ قریب قریب وہی طریق استدلال ہے جس کی بنا پر ایک گروہ اس سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کرنے کی مخالفت کر چکا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ان مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کا ترجمہ کرنا بھی اسی طرح ناجائز قرار پائے گا جس طرح غیر عربی میں خطبہ دینا ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ عربی زبان اسلام کی سرکاری زبان ہے، جو لوگ اسلام کے محکوم ہیں ان پر اس زبان سے واقف ہونا لازم ہے، اور اگر وہ عربی سے واقفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ ان کا قصور ہے

لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے قرآن کے مطالب کو ان کی مادری زبان، یا بالفاظ دیگر کسی "غیر سرکاری" زبان میں بیان نہیں کیا جائیگا۔ اسی طریقے سے آپ یہ بھی کہدیجیے کہ ان کے سامنے اسلامی احکام، اسلامی عقائد، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور دوسری "سرکاری" چیزوں کو بھی صرف سرکاری زبان ہی میں بیان کیا جائیگا - کوئی چیز غیر سرکاری زبان میں نہ بیان ہوگی خواہ وعظ کی صورت میں ہو یا تحریر کی صورت میں۔

فرمائیے! اگر کوئی شخص یہ پوزیشن اختیار کرے تو کیا آپ اس کو قبول کریں گے؟ غالباً نہیں، اس لیے کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ایسا کرنے سے مسلمانوں کی تقریباً ۸۰ فی صدی آبادی اسلام کے علم سے بالکل بے بہرہ ہو جائیگی۔ اسی بنا پر آپ قرآن حکیم کے ترجمے دوسری زبانوں میں کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں، اور اسی بنا پر آپ غیر سرکاری زبان میں سرکاری مضامین کی اشاعت کو مواعظ اور تحریروں کی شکل میں نہ صرف گوارا بلکہ پسند کرتے ہیں۔ جب حال یہ ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ تمام بحثیں صرف خطبۂ جمعہ کے مسئلہ میں پیدا ہوتی ہیں؟ مسجد میں اگر کوئی شخص نماز کے بعد یا خطبہ سے پہلے عجمی زبان میں وعظ کہے تو جائز بلکہ مفید اور انہی مضامین کو اگر وہی شخص منبر کی دو سیڑھیوں پر چڑھ کر خطبۂ جمعہ کی حیثیت سے بیان کرنے لگے تو ناجائز بلکہ بدعت! یہ کھلی ہوی ناہمواری جو آپکے طرزِ عمل میں پائی جاتی ہے، اس کو شریعت کی طرف منسوب کرنے سے پہلے اپنے نفس کو ٹٹول کر دیکھیے کہ وہاں کوئی غیر شرعی محرک تو چھپا ہوا نہیں ہے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عاداتِ قدیمہ کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں، اور جب کوئی مجتہد، حالات کے تغیر اور زمانہ کی بدلی ہوئی ضروریات کو محسوس کرکے طریقۂ متوارثہ میں ترمیم کی جرأت کرتا ہے تو وہ محض اس بنا پر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کے طبائع مانوس نہیں ہیں، مگر جب یہ نیا طریقہ چل پڑتا ہے اور اجنبیت دور ہو جاتی ہے تو لوگ اس کو نہ صرف جائز بلکہ مفید سمجھنے لگتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

نے جب قرآن مجید کا ترجمہ فارسی میں کیا تو اسی بنا پر ان کی مخالفت کی گئی تھی۔ ان سے پہلے ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جس میں عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں دعا کرنا، وعظ کہنا اور دینی مسائل پر اظہار خیال کرنا ایک نئی چیز تھی، اور لوگ اس پر معترض ہوتے تھے۔ ٹرکی میں جب پہلی مرتبہ جدید طرز پر فوجوں کو مرتب کرنے اور نئے آلات جنگ کا استعمال رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک جماعت نے اس پر سخت اعتراض کیا تھا۔ ان میں سے ہر موقع پر یہی کہا گیا کہ یہ بدعت اور احداث فی الدین ہے مگر آج کوئی نہیں جس کو ان چیزوں پر اعتراض ہو۔ اعتراض تو درکنار آج عامی اور عالم سب ان کو جائز بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ پر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے اعتراضات دراصل غیر شرعی محرکات سے پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کی تائید میں شریعت سے استدلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسلام میں عربی زبان کی حیثیت کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں صحیح اور غلط دونوں کی آمیزش ہے۔ بالکل درست ہے کہ اسلام سے عربی زبان کا خاص تعلق ہے۔ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی سیرت کے متعلق تمام معلومات عربی میں ہیں۔ اسلام کا صحیح علم حاصل ہونا، جس پر انسان کے مسلمان ہونے کا مدار ہے، عربی زبان کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ امت مسلمہ کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے بھی عربی زبان ایک ضروری اور ناگزیر آلہ ہے۔ انہی وجوہ سے ہر زمانہ کے علماء نے عربی کی تعلیم پر زور دیا ہے، اور انہی وجوہ سے آج بھی ہر صاحب عقل و فہم مسلمان یہ ضروری سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں عربی کو بحیثیت ایک ثانوی زبان کے لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے۔ یہ تمام باتیں بالکل برحق ہیں اور ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں "ہے" اور "چاہیے" میں بڑا فرق ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے لیے کوشش ضرور کیجیے، لیکن اگر وہ عالم واقعہ میں نہیں ہے تو اپنے طرز عمل کو واقعات کے مطابق بنانے سے انکار نہ کر دیجیے۔ عقل اور دین دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ مقصد کو وسیلہ پر مقدم رکھا جائے۔ ایک وسیلہ اگر زیادہ بہتر ہے،

لیکن اب کارگر نہیں رہا تو دوسرا وسیلہ اختیار کیجیے جو کارگر ہو، اگرچہ بہتر نہ ہو لیکن اگر آپ وسیلہ پر اصرار کرکے اصل مقصد کو کھو دیں گے تو یہ نہ عقلمندی ہے نہ دینداری۔ اب آپ خود غور کیجیے کہ دین کا اصل مقصد کیا ہے؟ آیا یہ ہے کہ عربی زبان کو "سرکاری" اور قومی زبان کی حیثیت سے پھیلایا جائے؟ یا یہ کہ خدا کے بندوں کو اس کی تعلیم اور اس کے احکام سے واقف کرایا جائے؟ ظاہر ہے کہ اصل مقصد ہی دوسری چیز ہے پس جب حال یہ ہے اور ہر شخص اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ غیر عرب ممالک میں دو فیصدی آدمی بھی عربی زبان سمجھنے والے باقی نہ رہے، اور ہم اُس طاقت سے محروم ہو چکے ہیں جس سے صدر اول کے مسلمانوں نے عربی کے علم کو پھیلایا تھا، تو آپ کو سونچنا چاہیے کہ ہمارے لیے صحیح طریق کار کیا ہے؟ یہ کہ مقصد اصلی کو کسی دوسرے ممکن ذریعہ سے حاصل کریں؟ یا یہ کہ قدیم ذریعہ پر اصرار کرکے مقصد کو فوت ہونے دیں؟

آپ نے جن دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ "دین کی اشاعت ایک ہی زبان میں ہونی ضروری ہے"، وہ درحقیقت نہایت کمزور ہیں، اور اگر آپ زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے تو ان کی کمزوری آپ پر خود ہی واضح ہو جائے گی۔ دین ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ انسانی زبانوں میں سے کسی کے ساتھ اس کا مخصوص بالذات رشتہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد دین کو اپنے بندوں تک پہنچانا ہے، اور اس مقصد کے لیے جس طرح وہ ایک انسان کو وسیلہ بناتا ہے اسی طرح ایک زبان کو بھی وسیلہ بناتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اسی دین کو پہونچانے کے لیے وہ دوسری قوموں کے انسانوں اور دوسری قوموں کی زبانوں کو بھی وسیلہ بنا چکا ہے۔ پس اگر آخری تبلیغ کے موقع پر اس نے عربی قوم اور عربی زبان کو وسیلہ بنایا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اب صرف عربی زبان ہی سے اسلام کا رشتہ ہو گیا ہے اور دوسری زبانوں کو تبلیغ دین کے لیے استعمال کرنا ناجائز یا مکروہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صریح ہدایت فرما دیتے کہ عربی زبان کے سوا کسی زبان کو تبلیغ دین کے لیے

قیامت تک استعمال نہ کرنا۔ حالانکہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو غیر زبانیں سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ اور عہدِ صحابہ میں حضرت سلمان فارسی جیسے غیر عربی الاصل حضرات عجمیوں کو ان کی اپنی زبانوں میں دین کی تعلیمات سمجھاتے تھے۔ رہی یہ بات کہ قیصرِ روم و شاہِ ایران کو جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے وہ عربی میں کیوں بھیجے گئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی دارالترجمہ نہ تھا۔ صحابہ میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو غیر زبانیں جانتے ہوں، اور جو لوگ جانتے تھے وہ بھی ان زبانوں کے ادیب نہ تھے کہ ایک نبیؐ کے شایانِ شان فصیح و بلیغ خط لکھ سکتے ہوں۔ نیز یہ بات حضور کو معلوم تھی کہ جن بادشاہوں کے نام آپ دعوت نامے لکھ رہے ہیں ان کو ایسے لوگ میسر آسکتے ہیں جو ان خطوط کا صحیح مفہوم انہیں سمجھا سکتے ہیں۔ پس حضور کا عربی میں اسلام کے دعوت نامے بھیجنا دراصل عملی زندگی کے موانع کا نتیجہ تھا، اور اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے پانی نہ ملنے کی صورت میں آپ نے تیمم کیا اور قیام کی طاقت نہ ہونے کی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو ہر جگہ آپ کے لیے ایک چشمہ پیدا کر سکتا تھا، اور آپ کو ہمیشہ بیماری اور ضعف سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ ایسی مثالوں سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں کہ شریعت دین کی تبلیغ کو صرف عربی زبان تک محدود رکھنا چاہتی ہے، اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ اس زبان سے واقف نہ ہوں ان کو ضلالت اور جہالت میں مبتلا رہنے دیا جائے۔

صحابہ کرام اور ائمہ متقدمین کی غیر زبانوں سے نفرت اور عربیت پر ان کے اصرار کے متعلق میں نے "تعصب" کا لفظ جو استعمال کیا تھا اس سے آپ غلط فہمی میں پڑ گئے۔ آپ نے یہ سمجھا کہ میں ان کی طرف "عصبیتِ جاہلیہ" کو منسوب کر رہا ہوں۔ حالانکہ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ تعصب محض جاہلیت ہی کا نہیں ہوتا۔ ایک قسم کا تعصب وہ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ہوتا ہے اور جس کو عیب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی جب چین جائیگا تو وہاں کی زبان، عادات، خصائل، طرزِ بود و ماند ہر چیز سے اجنبیت محسوس کرے گا۔ ان پر ناک بھوں چڑھائے گا۔ اور اس کو پسند نہ کرے گا کہ اس کے اہل و عیال

حیثیت اختیار کریں۔ یہ ایک فطری منافرت ہے جو ہر انسان کی طبیعت میں اجنبی چیزوں سے ہوتی ہے صحابۂ کرام بھی بہرحال انسان تھے اور عجمیت سے ان کی نفرت ایک حد تک اس بنا پر بھی تھی۔ اس میں مزید اضافہ اس وجہ سے ہو گیا کہ عجمی اقوام اس وقت سب کی سب کافر تھیں اور ان کے جو افراد مسلمان ہو جاتے تھے ان کو صحابۂ کرام عربیت کے رنگ میں رنگ لینا ضروری سمجھتے تھے تاکہ وہ کفار کی جمعیت سے الگ ہو کر اہل اسلام کی جمعیت میں جذب ہو جائیں۔ نیز صحابۂ کرام یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمان (جو اس وقت تک تمام تر عرب ہی تھے) عجمی ممالک میں اہل عجم کی سی بولیاں بولنا اور ان کے سے لباس پہننا شروع کر دیں کیونکہ اس طرح کفار کی اکثریت میں ان کے جذب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ پس صحابۂ کرام نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کی بنیاد دو وجوہ پر تھی۔ ایک وجہ فطری تھی، اور دوسری وجہ حالات کے اقتضاء سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں سے پہلی وجہ کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی اس لیے اس کو حجت بنانا درست نہیں۔ رہی دوسری وجہ تو اب وہ حالات باقی نہیں ہیں۔ اردو، فارسی، ترکی، جاوی، اور ایسی ہی دوسری زبانیں بھی عربی کی طرح اب مسلمانوں کی زبانیں ہیں، اور ان سے کسی اسلامی مصلحت کے تحت نفرت و اجتناب کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔

کیا خطبۂ غیر عربیہ واجب ہے؟

مراد آباد سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

جناب نے خطبۂ غیر عربیہ کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ خطبۂ جمعہ غیر عربی میں دیا جانا صرف جائز ہے اور یہ کہ سامعین کی زبان میں دیا جاسکتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی درجہ میں ضروری نہیں ہے کیونکہ جواز کا اطلاق اولویت، عدم اولویت، اباحت، حتّٰی کہ کراہت پر بھی کیا جاسکتا ہے چنانچہ اسی کا باعث ہے کہ آخر میں جناب نے "جو عملی مشکلات" تحریر فرمائی ہیں اُن سے متاثر ہو کر اپنی رائے موجودہ طرز عمل کی پسندیدگی اور خطبۂ غیر عربیہ کے عدم اجرا کی بہتری کے متعلق صاف طور پر ظاہر فرمائی ہے۔ حالانکہ اگر جناب کے نزدیک یہ کوئی ضروری چیز ہوتی تو ان احتمالی مضرتوں سے متاثر ہو کر ایسا کرنے کے بجائے ان کی اصلاح کے ذرائع پر زور دیا جاتا اور چاہے ان میں کامیابی متوقع ہوتی یا نہ ہوتی بہرحال خطبہ کو سامعین کی زبان میں دیا جانا ضروری قرار دیا جاتا اس لیے کہ کوئی واجب چیز کسی مصلحت یا مضرت سے متروک العمل نہیں ہو سکتی۔ البتہ وہ جائز چیز جو اولویت یا اباحت وغیرہ کے معنی میں ہو بعض مصالح و مضار کی بنا پر ترک ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جلب منفعت اور دفع مضرت کے جو ذرائع ہوں ان کا اختیار کرنا بھی بجائے خود ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک وہ ذرائع حاصل نہ ہوں ہم ایک واجب کو ترک کیے بیٹھے رہیں اور شارع نے جو ہمارے افادہ اور استفادہ کے لیے ہر ہفتہ ایک اجتماع کا موقع پیدا کیا تھا اس کو آئندہ کے لیے بھی ہم اسی طرح ضائع کرتے رہیں جس طرح کہ اب تک کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ خطبۂ جمعہ کم از کم واجب ضرور ہے اور یہ بھی آپ کو مسلم ہے کہ اس کا مقصد ذکر اللہ اور

رجوع الی اللہ کے ساتھ وعظ و تذکیر اور احکام دین کی تعلیم و تبلیغ بھی ہے پس جب خطبہ واجب تو اس کے مقاصد کی تحصیل بھی واجب۔ اور اظہر من الشمس ہے کہ اس کے مقاصد کا جزو اعظم بدون سامعین کی زبان اختیار کیے حاصل نہیں ہو سکتا تو بحکم مقدمۃ الواجب واجبٌ اس کا اختیار کرنا بھی واجب ہوگا۔

پس واجب ہوا تو پھر کسی مصلحت او مضرت کی وجہ سے اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں جن مضرتوں کا وقوع متوقع ہو ان کی اصلاح کے لیے سعی مستقل طور پر ضروری ہے۔

خطبہ غیر عربیہ کے اجرا میں جو سب سے بڑی مضرت آپ نے ظاہر فرمائی ہے وہ مسائل مختلف فیہ کا بیان اور ان کی وجہ سے نزاعات کا رونما ہونا ہے لیکن آپ نے اس کے اور نیز دوسرے مقاصد کے انسداد کی جو تدبیر بیان کی ہے میری رائے میں وہ بھی کافی نہیں ہے اس لیے کہ اول تو بقول آپ ہی کے اس کی امید ہی کم ہے اور میرے نزدیک تو آجکل کے علماء کی طرف سے کسی ایسے کام کا انجام پا جانا گویا کہ خرق عادت ہے۔ تو ایسی حالت میں نہ تو نومن تیل ہوگا اور نہ رادہا ناچیگی پس نتیجہ معلوم کہ وہی تیلی کے بیل کی طرح جہاں تھے وہاں ہی رہیں گے۔

دوسرے یہ کہ فرض کیجیے کہ اہل علم کی کسی معتدل جماعت ہی کے تیار کردہ خطبے جاری کیے اور ان میں نزاعی مسائل سے کوئی تعرض بھی نہیں کیا گیا تاہم وہ خطیب جس کی زبان میں بقول آپ کے اللہ نے ایسا ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا اور جو اپنے مشرب میں اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں کر سکتا، وہ اس معتدل جماعت ہی کے تیار کردہ خطبے پڑھنے کے باوجود اپنے مشرب کی تبلیغ اور اس کے خلاف سے تعرض کیے بغیر کیسے رہ سکے گا؟ اول تو کسی مقرر کے نزدیک یہ امر کچھ مشکل نہیں ہے کہ اپنی تقریر کا رخ جدھر چاہے پھیر دے۔ پھر خصوصیت سے مولوی مقرر کو تو ایسا کر لینا بہت ہی سہل ہے، مولوی اپنے مشرب کی تبلیغ کرتا ہے تو قرآن اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، دوسروں کی تردید کرتا ہے تو قرآن

اس کی زبان پر ہوتا ہے، کسی کی مدح کرتا ہے تو قرآن سے اس کا استدلال ہوتا ہے، کسیکو گالیاں دیتا ہے تو قرآن ہی سے اس کا استناد ہوتا ہے، غرض وہ اپنے ہر اس قول و فعل کو جس پہ اُس کو کسی نہ کسی حدتک اصرار ہے یا کسی وجہ سے اس کو پسند ہے قرآن ہی کی آیات تلاوت کرکے لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، چاہے فی الحقیقت اس کا وہ مسلک شریعت حقہ کی روشنی میں بالکل ہی باطل محض ہو۔ پس ایسی حالت میں وہ کونسی قوت ہے جو اس کو روک سکے؟

اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جاوے کہ وہ خطیب صرف انہیں مرتب شدہ خطبوں کے مضامین میں اپنی تقریر کو منحصر رکھے اور اس کے علاوہ کسی مضمون پر زبان نہ کھولے تو یہ چیز ایک حدتک پھر خطبہ کے اصل مقصد کو فوت کردیگی اس لیے کہ اس کے مقاصد میں یہ بھی داخل ہے کہ خطیب حسب ضرورت زمان و مکان کی حالت کے مناسب خطبہ دے ورنہ دق کے مریض کو ہیضہ کا علاج بتلانے کے مرادف ہوگا۔ اور اس صورت مذکورہ میں وہ اگر بالکل نہیں تو من وجہ موجودہ صورت مروجہ کے مشابہ ضرور ہو جائیگا فرق صرف تبدیل لسان کا ہوگا اور مضامین میں وہی تعیین و تقیید رہے گی جواب ہے اور متعدد مضامین کے خطبوں کا بھی اس غرض سے ہونا کہ انہیں سے جو مناسب ہو پڑھ لیا جایا کرے کافی نہوگا کیونکہ ہر جگہ اور ہر وقت کی بعض ضرورتیں مخصوص ہوتی ہیں جو ان مضامین میں نہیں آسکتیں جو عمومی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوے مرتب کیے گئے ہوں۔

اور اگر ان تمام امور سے بھی نظر کو منقطع کرلیا جاوے تو ان خطبوں میں کم از کم علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین الخ من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد، و ایاکم و محدثات الامور، کل بدعۃ ضلالۃ۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشآء الخ۔ یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ اور مضامین تو ضرور ہی ہوں گے۔ کم از کم کلمۂ شہادت ہونا اور اس میں اشھد ان

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ - کا پڑھا جانا تو بالکل یقینی امر ہے۔ پس اس نیش زن مولوی کو تو یہی بہت ہے اگر وہ اپنی سرشت کے مطابق چاہیگا تو اسی کے ضمن میں سب کچھ کہہ سکتا ہے، اپنے مشرب کے اعتبار سے رداً و قبولاً ہر حیثیت سے اس میں گفتگو کو طویل کر سکتا ہے۔

پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اختلافی مسائل سے مطلقاً روک دینا کیوں ضروری قرار دیا گیا؟ اس میں جو مضرت بیان کیگئی ہے اس کے ممکن الوقوع ہونے سے انکار نہیں ہے لیکن کیا محض ایک محتمل خیر کی خاطر یقینی مضرت اختیار کی جا سکتی ہے؟

یہ ضرور ہے کہ جب تک کوئی خاص ضرورت اور مقامی حیثیت سے ان مسائل کو بیان کرنے کی وقتی مصلحت پیش نہ آوے، بلا وجہ ان مسائل پر لب کشائی نہ کی جائے لیکن جب ضرورت داعی ہو تو پھر ان کی تبلیغ بھی ایسی ہی ضروری ہونی چاہیے جیسی دوسری اصلاحات کی۔

ظاہر ہے کہ فی زمانناً جو زیادہ فسادات اور نزاعات رونما ہوتے ہیں وہ اکثر شرک و بدعت کی مذمت اور ان کی جزئیات کی تفصیل سے واقع ہوتے ہیں اور یہ موضوع مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایسا ضروری ہے کہ بہر حال ناگزیر ہے اور کسی وقت کسی حال میں اس سے تغافل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر خطبہ میں اصلاح عقائد، توحید و رسالت کا اصل مفہوم، اعتصام بالسنۃ، اجتناب عن البدعت، شرک کی مذمت اور اس کے اقسام کی تفصیل ہی سے سامعین کو خبردار نہ کیا گیا تو میں نہیں سمجھتا کہ ان مضامین سے زیادہ کونسا وہ موضوع ہے جو مسلمانوں کے دین کی اصلاح سے متعلق ہوں،

پس میری رائے میں صرف یہی طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ کا وہ حصہ جو تبلیغ احکام سے متعلق ہو لازماً بہر حال زبان سامعین میں ہونا ضروری ہے اور جن مضرتوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ان کا انسداد دوسرے خارجی ذرائع سے کیا جائے مثلاً یہ کہ خطباء کو بذریعہ تحریر و تقریر سمجھا دیا جاوے کہ وہ بلا ضرورت ان مسائل کی تفصیل میں نہ پڑا کریں اور جب ضرورت ہو تو بیشک بیان کریں

مگر طرز بیان تشدد آمیز اور ڈنک مارنے والا نہ ہو۔ صاف اور سیدھے طریقہ سے نرم الفاظ میں مسلک حق کو واضح کیا کریں۔ ذاتیات کے حملوں سے بچتے رہیں۔

آخر اب بھی تو اس قسم کے مولویوں کی تقریروں سے نزاعات ہوتے ہی ہیں اُن کو روکنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اُنپر یہاں بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔

پھر قابل لحاظ یہ امر بھی ہے کہ اب تو اس قسم کے اختلافات کا اثر عوام پر اس درجہ گہرا ہو چکا ہے کہ اکثر و بیشتر ایک عقیدہ اور خیال کا آدمی دوسرے عقیدہ اور خیال والے کی اقتداء ہی نہیں کرتا اور ہر عقیدہ و خیال کے لوگوں کی نماز جماعت عموماً اور نماز جمعہ خصوصاً الگ الگ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی اقتدار سے محترز ہے مسجدیں سب کی الگ الگ باعتبار اکثریت کے بنی ہوئی ہیں، پس اپنے اپنے ہم خیال لوگوں او سا بنی اپنی مسجدوں میں جیسی چاہیں تقریر کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ کوئی مانع نہیں ہو سکتا اور اکثر نہیں ہوتا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے صرف ان دو فرقوں کو ذہن میں لے کر عرض کیا گیا ہے جو عوام کی زبان میں دیوبندی اور بریلوی وہابی اور بدعتی کے ناموں سے مشہور ہیں اس لیے کہ ہندوستان میں انھیں دونوں کی کثرت ہے اور واقعات کے اعتبار سے بھی جہاں جہاں فسادات ہوتے ہیں غالباً ان دونوں کے علاوہ اور فرقوں میں نہیں ہوتے یا مجھکو معلوم نہیں لیکن اگر ہوتے ہوں گے تو بہت ہی کم۔ بہرحال اکثریت کے لحاظ سے یہی دونوں زیادہ قابل لحاظ معلوم ہوئے۔ اور جب اکثریت کے بارے میں میری یہ رائے ہے تو اقلیتوں کے متعلق تو بدرجہ اولی سمجھنی چاہیے۔

رہا موضوعات اور بے اصل قصص کے بیان کا خطرہ تو وہ اس طرح رفع ہو سکتا ہے کہ ہر جگہ کے با اثر لوگ اس امر کا خاص اہتمام کریں کہ امامت جمعہ کے لیے جاہل اور پیشہ ور واعظوں کو ہرگز منتخب نہ کریں حتی الامکان مستند اور ذی فہم علماء کے سپرد یہ کام کیا جائے یا اگر وہ عالم مستند نہ ہو تو مشاہیر

علما میں سے کوئی صاحب اس کو قابل اعتماد اور اس کے بیان کو قابل سماعت تجویز کردیں۔

پھر علماء کی طرف سے کوئی ایسا رسالہ ان تمام آئمہ کے لیے تالیف کر کے شائع کردیا جائے جس میں واضح طور پر ان مفاسد سے بچنے کے اصول تبلادئے گئے ہوں۔ مثلاً یہ کہ کوئی روایت حدیثی یا قصہ تاریخی بدون کامل تحقیق کے نہ بیان کیا کریں یا یہ کہ فلاں کتاب فلاں ابواب میں فلاں فلاں شرائط سے اس قابل ہے کہ اس کی روایات کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ اور فلاں فلاں کتاب ایسی ہے کہ اس سے غیر محقق کو بالکلیہ اجتناب کرنا چاہیے۔ غرض یہ یا اور جو مفید امور ہوں اس رسالہ کے ذریعہ ان سے ان ائمہ جمعہ کو آگاہ کردیا جائے۔ میری رائے میں اس طرح کرنے سے اس مفسدہ کا غالباً بہت بڑا انسداد ہوسکیگا۔

ھذا ما عندی والعلم عند اللہ العلیم الخبیر

ترجمان القرآن۔ یہ ایک عجیب صورت حال ہے۔ ایک جماعت عجمی زبان کے خطبہ کو مکروہ تحریمی ثابت کرتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا فاعل گنہگار ہو۔ دوسری جماعت اسی چیز کو واجب ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تارک گنہگار ہو۔ چیز ایک ہی ہے، مگر اس پر دو بالکل متضاد حکم لگائے جاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی شریعت جن اصولوں پر قائم ہے ان میں کامل یکسانیت ہے، اور ان کی یکسانیت کا اقتضا یہ ہے کہ ہر چیز کے متعلق حکم ایک ہی ہو۔ اس قسم کے متضاد احکام کو دیکھ کر بیچارے ناواقف عوام سخت حیرانی میں پڑ جاتے ہیں کہ آخر ہم کیا کریں۔ ایک کام کرتے ہیں تو گناہ گار، نہیں کرتے تو گناہ گار۔ کسی کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ شائد اس شریعت ہی میں کوئی نقص ہے جس کی بنا پر ایسے متضاد احکام اخذ کیے جاتے ہیں یا کیے جاسکتے ہیں۔ کوئی علماء سے بدگمان ہوجاتا ہے اور انہیں چھوڑ کر خود اپنی ناقص عقل اور ناقص علم سے احکام کی الٹی سیدھی تعبیریں کرنے لگتا ہے۔ کسی کو علوم دینیہ کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان وسائل ہی کی جڑ پر کلہاڑی مارنے لگتا ہے جو در حقیقت احکام شرع معلوم کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ آجکل جو نئے نئے فتنے مسلمانوں میں پیدا ہو رہے ہیں ان کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ لوگ جو مذہبی معاملات میں

مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ ان کو ابتک اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ یہ خرابیاں ان کے کس طرز عمل سے پیدا ہو رہی ہیں، اور خود ان کے طرز عمل میں کیا خرابی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جن امور کو شارع نے صریح طور پر فرض یا واجب یا حرام یا ناجائز ٹھیرا دیا ہے صرف وہی ان اصطلاحوں سے موسوم کیے جا سکتے ہیں، اور انہی کے فعل یا ترک پر گناہ یا ثواب کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ باقی رہے وہ امور جو ہم اپنے قیاس و استدلال کے ذریعہ سے شارع کے قول یا عمل سے مستنبط کرتے ہیں، تو ان کو فرض یا واجب قرار دینا، یا حرام یا ناجائز ٹھیرانا اور ان کی بنا پر ثواب یا عقاب کا حکم لگانا اصلاً غلط ہے، اس لیے کہ انسان کو انسان پر کوئی چیز فرض و واجب کرنے یا حرام و ناجائز ٹھیرانے کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے اور عذاب و ثواب خدا کے اختیار میں ہے نہ کہ انسان کے اختیار میں۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (النحل: ۱۵) ایک بڑے سے بڑا عالم اور امام جلیل القدر بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہنے کا حق رکھتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے ایسا سمجھتا ہوں، میرے نزدیک فلاں بات کی جا سکتی ہے یا اس کا کرنا اولیٰ ہے یا فلاں بات نہیں کی جا سکتی یا اس کا کرنا درست نہیں۔ اگرچہ رائے کا اختلاف اس صورت میں بھی باقی رہتا ہے، اس لیے کہ ایک شخص کا فہم دوسرے شخص کے فہم سے بالکل مطابق تو نہیں ہو سکتا، لیکن یہ اختلاف احکام شریعت میں نہیں بلکہ انسانی اجتہاد میں ہوگا اور اس کی بنا پر وہ فرقے نہ بن سکینگے جو اجتہادی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کو گنہگار اور گمراہ ٹھیراتے ہیں، اور اِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا کے مصداق بن گئے ہیں۔

اس اصل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس کے بعد زبان خطبہ کے مسئلہ پر غور کیجیے۔ شارع نے کہیں یہ تصریح نہیں فرمائی کہ خطبہ فلاں زبان میں دینا واجب ہے یا فلاں زبان میں دینا مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح شارع نے

ان مقاصد کی تفصیل بھی بیان نہیں کی جن کے لیے خطبہ کو نماز جمعہ کے ساتھ لازم کیا گیا ہے۔ اس باب میں جتنی مختلف باتیں مختلف خیالات کے اہل علم بیان کرتے ہیں وہ شارع کے کسی صریح حکم پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے صاحب شریعت کے عمل کو دیکھ کر اپنی فہم کے مطابق مختلف امور اخذ کیے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک گروہ کا فہم صحیح ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے گروہ کا فہم صحیح ہو۔ دونوں کو اپنے اپنے دلائل پیش کرنے کا حق ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنے فہم سے جو حکم وہ نکال رہا ہے اسے واجب ٹھیرائے اور اس کے تارک کو گناہ گار قرار دے لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس کے دلائل کو وہ زیادہ وزنی سمجھیں اور جس کی رائے پر ان کو اطمینان ہو جائے اس کا اتباع کر لیں۔ شارع کا تصریح نہ کرنا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے لوگوں کو اس باب میں آزادی بخشی ہے۔ اگر اس میں لوگوں کے طریقے مختلف ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں جس کا مسلک زیادہ قوی دلائل پر مبنی ہوگا، اور جس کی رائے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کو زیادہ مطمئن کرنے والی ہوگی اسی کے اتباع پر بالآخر سواد اعظم مجتمع ہو جائے گا۔ اور اختلاف عمل کا دائرہ خود بخود گھٹتا چلا جائے گا۔

خطبۂ غیر عربیہ کو واجب قرار دینے کے لیے جو طریق استدلال ہمارے مراسلہ نگار نے اختیار کیا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ نماز کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد رجوع الی اللہ ہے اور رجوع الی اللہ بغیر خشوع وخضوع کے ممکن نہیں۔ اور جس چیز پر فرض کے مقصد کا حصول موقوف ہو وہ بھی فرض ہونی چاہیے، لہٰذا خشوع وخضوع بھی نماز ہی کی طرح فرض ہے یہ طرز استدلال ممکن ہے کہ منطق کی رو سے درست ہو مگر شرع کی رو سے درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ شخص امت پر ایسی چیز فرض کرتا ہے جسے خدا نے فرض نہیں کیا۔ شریعت میں صرف وہی چیز فرض یا حرام ہے جس کو خدا نے فرض یا حرام قرار دیا ہے ہم کو منطقی استدلال سے فرائض اور حرمات کی فہرست میں اضافہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پچھلی امتوں نے یہی غلط طریقہ اختیار کر کے اپنے اوپر وہ بہت سی چیزیں لازم کر لی تھیں جو خدا نے ان کے اوپر لازم نہیں کی تھیں اور

یہی وہ بوجھ اور پھندے تھے جن سے انسانیت کو آزاد کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف : ١٩)

پس زبان خطبہ کے متعلق جو رائے میں نے ظاہر کی ہے، اور اس کے خلاف جو رائے بعض علماء کرام ظاہر فرماتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ لوگوں پر اس کا ماننا واجب ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے ان پر کوئی گناہ لازم آتا ہو۔ اگر کوئی شخص مفتیانہ تحکم کے انداز میں اپنی رائے بیان کرتا ہے تو یہ اسکی غلطی ہے۔

میں نے زبان خطبہ کو بدلنے سے پہلے جن امور کی اصلاح کو ضروری قرار دیا ہے ان پر صاحب مراسلہ نے پوری طرح غور نہیں فرمایا اسی بنا پر وہ شبہات پیدا ہوئے جو انہوں نے بیان کیے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ شرعی نظام کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے اسلام کا کوئی حکم اپنی اصل پر باقی نہیں رہا ہے جمعہ اور خطبہ ہمارے شرعی نظام کے اہم ترین اجزاء میں سے تھے۔ ایک عظیم الشان اجتماعی مقصد تھا جس کی تحصیل کے لیے دوسرے اجزاء کے ساتھ ان دونوں چیزوں کو بھی خاص حکیمانہ تناسب سے ایک نظام میں نصب کیا گیا تھا۔ اب وہ نظام ٹوٹ گیا، اجزاء پراگندہ ہو گئے، ان کا باہمی ربط اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ان سب کا مجموعی ربط ٹوٹ گیا، اور سرے سے وہ عظیم الشان مقصد ہی اب دلوں سے محو ہوتا جا رہا ہے جس کے لیے تمام اجزاء فراہم کیے گئے تھے! اس حالت کی صحیح اصلاح تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ شرعی نظام پھر سے قائم کیا جائے اور اس کے بکھرے ہوئے اجزاء کو پھر اسی طرح جمع کر کے ایک مشین کے پرزوں کی طرح نصب کر دیا جائے تاکہ اس کی حرکت کے ساتھ ہی وہ نتائج برآمد ہونے شروع ہو جائیں جو اس سے مطلوب ہیں۔ تاہم اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اتنا ہی ہو کہ مسلمانوں میں ایک رائے عام پیدا کی جائے، بڑے پیمانہ پر نہیں تو چھوٹے پیمانے پر ہی ان کو اپنے اجتماعی کام ایک نظم کے ساتھ انجام دینے کی عادت ڈالی جائے، اور رائے عام کی طاقت سے ان مضرتوں کا سد باب کیا جائے جو غیر ذمہ دار لوگوں کی منتشر حرکات سے پیدا ہوتی ہیں

لیکن اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اصلاح کا نام نہ لیجیے، اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اسی طرح ہونے دیجیے، کیونکہ ہر شخص اپنے ذہن میں اصلاح کا جو مفہوم سمجھے بیٹھا ہے، اگر وہ اسی کے مطابق انفرادی طور پر عمل شروع کر دے تو بے شمار مصلحین، ایک دوسرے کے خلاف عمل کرنے والے پیدا ہو جائیں گے اور ان کی کارگذاری کا نتیجہ اصلاح کے بجائے مزید فساد ہوگا۔

نظام شرعی میں خطیب جمعہ کی حیثیت محض ایک واعظ کی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اپنے حلقہ کی جماعتِ مسلمین کی نگرانی کرنے اور ان کی اجتماعی زندگی کو مفاسد سے بچانے اور ان سب کو عام قومی پالیسی کے مطابق چلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری بجائے خود ایک معلم ہے جس شخص پر اس کا بار پڑتا ہے، وہ خود ذمہ داری ہی سے سیکھ لیتا ہے کہ اس سے کیونکر عہدہ برا ہو۔ بخلاف اس کے ایک غیر ذمہ دار شخص جو نہ کسی نظام جماعت سے تعلق رکھتا ہو، نہ کسی کے سامنے جوابدہ ہو، نہ اس امر کا کوئی تصور رکھتا ہو کہ اس کا خطبہ جماعت کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اثر انداز ہوتا بھی ہے یا نہیں، ایسا شخص خطبۂ جمعہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ جماعت کی فلاح و بہبود کن چیزوں کی مقتضی ہے؟ کون سے مفاسد ہیں جن کی اصلاح اس کو پہلے کرنی چاہیے؟ کن تعلیمات کی تلقین اور کن احکام کی تبلیغ مقدم ہے اور اس کام کو کس طرح انجام دیا جائے کہ فائدۂ مطلوب حاصل ہو؟ ہمارے جمعوں کے امام چونکہ کوئی ذمہ دارانہ حیثیت ہی نہیں رکھتے اس لیے درحقیقت وہ خطیب کے ان فرائض کو ادا کرنے کے ناقابل ہیں۔ وہ اگر عالم بھی ہوں تو ان کی حیثیت ایک واعظ اور مبلغ کی رہیگی، وہ محض اپنے شخصی اختیار تمیزی کی بنا پر تعلیم و تبلیغ کریں گے اور اس سے کوئی خاص اجتماعی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے غیر ذمہ دارانہ مواعظ سے یہ تھوڑی بہت اجتماعیت بھی جو اب حاصل ہوتی ہے، پراگندہ ہو جائے گی۔

اگر نظام شرعی کا احیاء اس وقت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر نظر آ رہا ہے، تو آخری صورت وہی ہے

جو میں نے بیان کی ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت، جو کسی حد تک ذمہ دارانہ حیثیت رکھتی ہو، خطبات جمعہ مرتب کرنے کے لیے مقرر ہونی چاہیے، اور اس کو ایسے خطبات مرتب کرنے چاہئیں جن میں اصول اسلام کو غیر اختلافی طریقوں سے بیان کیا جائے، مسلمانوں میں وحدتِ قومی کا احساس پیدا کیا جائے، ان کو عام اخلاقی مفاسد اور خلاف شریعت اعمال پر (جو متفق علیہ ہیں) متنبہ کیا جائے، اور ایسے احکام بیان کیے جائیں جن سے مسلمانوں کے کسی فرقہ کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ اجتماع جمعہ کے مقاصد کی تحصیل کا کم سے کم ذریعہ یہی ہے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ مختلف فرقوں کے جمعے جو الگ الگ ہونے لگے ہیں، ان کو بند کیا جائے اور ایسی صورتیں پیدا کی جائیں کہ کم از کم جمعہ میں تمام یا اکثر فرقوں کے مسلمان ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں جمعوں کا الگ ہونا غایت درجہ نقصان دہ چیز ہے۔ اس کو مٹانے کی ضرورت ہے۔ نہ یہ کہ ایسے اسباب پیدا کیے جائیں جن سے یہ بیماری اور زیادہ ترقی کرے۔ واعظوں کو اگر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق وعظ کہنا ہے اور وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو وہ مسجدوں سے باہر جہاں چاہیں لب کشائی کریں مسجدیں جمع کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں، نہ کہ تفریق کرنے کے لیے۔ ان کو مساجد ضرار بنانا ایک بدترین فعل ہے جسے کسی حال میں گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

تنزیل و تاویل

تفسیر آیۂ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ

(۲)

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

قرائن سے استدلال اس میں تو شک نہیں کہ سورۂ انفال میں غزوۂ بدر پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے مسلمانوں کو اصول جنگ کی تعلیم دیگئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسی سورہ کی بعض آیات میں ذرا ذرا وقفہ کے بعد یہودیوں پر کیوں نشترزنی کی گئی ہے اگر واقعی غزوۂ بدر کے سلسلہ میں انھوں نے کوئی شرارت نہیں کی تھی؟[1] قرآن کا جواب اثبات میں ہے یہی نہیں بلکہ اس کا دعوی ہے کہ بدر کی لڑائی یہودیوں ہی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی چنانچہ اسی سورۂ (انفال) کی ایک آیت سے قرآن کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے ملاحظہ ہو۔

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَ — اور یاد کرو جب شیطان نے انکی تدبیروں کو اچھا
قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ وَإِنِّي جَارٌ لَكُمْ — کر دکھایا اور کہا کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور

[1] ترجمان القرآن۔ یہ کس نے کہا کہ سورۂ انفال میں یہودیوں کا کہیں ذکر نہیں آیا؟ سوال تو یہ تھا کہ یہودیوں سے خطاب کہاں کیا گیا ہے؟ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ سورۂ انفال میں غزوۂ بدر پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس تبصرہ کے مخاطب کفار نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو خطاب کرکے جنگ بدر کے اسباب اور نتائج اور مسلمانوں کی کامیابی کے وجوہ اور ایسے ہی دوسرے امور پر کلام کیا جائیگا تو اس میں دوسرے فریق کی کمزوریوں اور اسکے جرائم کا بھی ذکر آئیگا لیکن یہ ذکر اس حیثیت سے نہ ہوگا کہ خود وہی فریق اس کا مخاطب ہے بلکہ اس حیثیت سے ہوگا کہ مسلمان انکی شرارتوں سے واقف ہوں اور یہ بھی جان لیں کہ اس کے کمزور پہلو کون سے ہیں۔

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْۤءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴۸ - انفال)

میں تمہارے ساتھ ہوں، پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں کھسک گیا اور بولا کہ مجھے کچھ مطلب نہیں میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔

مذکورۂ بالا آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے کافروں کو مسلمانوں کے خلاف شہ دی تھی۔ ممکن ہے کسی کو اس مقام پر شبہہ ہو کہ مذکورۂ بالا آیت میں یہود کا کہاں تذکرہ ہے؟ اس شبہہ کا امکان ہے لیکن اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس مقام پر شیطان سے یہودی ہی مراد ہیں اور اس معنی میں یہ لفظ غریب نہیں ہے بلکہ اسی معنی کی تعبیر کے لیے بے شمار مقامات پر آیا ہے۔ اطمینان کے لیے سورۂ بقر کی آیت (۱۴) اور سورۂ مجادلہ کی آیت (۱۰) کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے[2] خوف طوالت مانع ہے اور نہ اس مفہوم

[1] ۔ ترجمان القرآن ۔ یہاں ہمارے فاضل دوست نے اِنِّیْۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ کے الفاظ کو متن اور ترجمہ دونوں میں چھوڑ دیا ہے یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے قصداً ایسا کیا ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ الفاظ ان کے مدعا کے خلاف پڑتے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت میں شیطان سے مراد یہود ہیں۔ مگر آیت میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ شیطان نے جب دونوں کو مقابل دیکھا تو بول اٹھا کہ "اے کافرو! میں تم سے بری الذمہ ہوں۔ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تمہیں نظر نہیں آتی میں اللہ سے ڈرتا ہوں"۔ خط کشیدہ الفاظ میں صریح اشارہ ہے اس لشکر ملائکہ کی طرف جو اصحاب رسول کی مدد کے لیے خدا نے بھیجا تھا (اِنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُرْدِفِیْنَ) اور جس کے متعلق سورۂ توبہ میں جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا کہا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس غیر مرئی طاقت کو دیکھنا اور خدا کے عذاب سے ڈر کر بھاگ جانا اسی شیطان کا فعل ہو سکتا ہے جو ناری الاصل ہے، نہ کہ یہود کا۔ اگر آپ کو اس بات سے انکار ہے تو ارشاد ہو کہ یہودیوں نے آخر کونسی چیز دیکھی تھی جو کفار مکہ نہیں دیکھ سکتے تھے؟

[2] ۔ یہاں ہمارے فاضل دوست ایک غلطی کو سہارا دینے کے لیے دوسری غلطی اور عظیم تر غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ قرآن میں جہاں کہیں الشیطان الف لام تعریفی کے ساتھ آیا ہے وہاں شیطان سے مراد وہی ناری مخلوق ہے جس سے بنی آدم کی ازلی عداوت چلی آتی ہے اور جس کا کام انسان کو بہکا کر غلط راستہ پر لے جانا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کہیں انسانوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، تو تحقیق سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ قرآن میں جن مقامات پر شیطان سے انسان مراد ہیں وہاں الف لام تعریفی نہیں ہے اور اس معنی پر دلالت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی صریح قرینہ موجود ہے مثلاً سورہ بقر کی چودھویں آیت میں یہ الفاظ ہیں: وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ۔ سورہ انعام میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ "(عربی)"

باقی حاشیہ بر صفحہ

کی آیات نقل کرتے۔

ایک دوسرے مقام پر پیش نظر سورہ ہی میں یہودیوں پر یوں نیش زنی کی گئی ہے۔

(۲) اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ الآیۃ	بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ ہیں جنہوں نے انکار کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے ان میں سے جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا وہ ہر بار اپنا عہد توڑتے ہیں اور ان کو ذرا خدا کا خوف نہیں ہے۔

سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ اس آیت میں شرالدواب سے یہود اور کفار قریش دونوں کی تعریض ہے بلکہ اولیت یہود کو حاصل ہونی چاہیے اس لیے کہ اسلام کی فیصلہ کن لڑائی (بدر) میں باوجود یکہ ان کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا ان کی آتش غضب بھڑک اٹھی اور انہوں نے ان تمام عہود و مواثیق کو جو مسلمانوں سے تھے ایک ایک کرکے توڑ ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اس لیے کیا کہ بدر کی فتح مبین نے انھیں اندیشہ ناک کر دیا تھا اور انھیں علانیہ نظر آنے لگا تھا کہ اسلام کا بے پناہ سیلاب ان کے خود غرضانہ اقتدار اور جابرانہ تسلط کو بہالے جائے گا۔ اس لیے انہوں نے کھلم کھلا نقض عہد کا اعلان کر دیا چنانچہ طبقات ابن سعد میں بنو قینقاع کے تذکرہ میں ہے۔

فلما کانت وقعۃ بدر اظھروا البغی والحسد و نبذوا العھد و المرۃ ،	جب یہ بدر کی لڑائی ہوئی تو یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔

تکلہ حاشیہ صـ۱۰۳ اس قسم کا کوئی قرینہ سورۂ انفال کی زیر بحث آیت میں نہیں پایا جاتا۔ اس لیے الشیطان سے الیہود مراد لینا کسی طرح درست نہیں۔ رہی سورۂ مجادلہ کی دسویں آیت تو اس میں شیطان سے مراد یہود ہرگز نہیں ہیں اس میں تو بہ فرمایا گیا ہے کہ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ۔ خفیہ سازباز کی باتیں کرنا ایک شیطانی فعل ہے یا شیطان کی تحریک سے ہوتا ہے

ایک دوسرے مقام پر اسی سورہ میں یوں ہے۔

(۳) وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال ۶۰)

اور تیار کرو ان کی لڑائی کے لیے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پہنچے اللہ کے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسرے اعداء پر جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں آخرین سے ان دشمنان اسلام کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے جو بظاہر فتنہ و فساد سے دور رہتے ہیں لیکن حقیقت میں دوبے ہوئے فتنوں کو وہی ہوا دیا کرتے ہیں[۱]۔ ظاہر ہے یہ عظیم الشان کام یا تو اغراض پرست یہود اچھی طرح انجام دے سکتے تھے یا منافقین اس لیے کہ یہ دونوں جماعتیں اغراض دنیا کی غلام تھیں۔ اور یہ مسلم ہے کہ کوئی سا ہو کار کسی جماعت کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ اُسے سب کا اندوختہ سمیٹنا ہوتا ہے اور اگر اسی طرح وہ لوگوں سے لڑائی لیتا رہے تو کیا خاک اس کا اندوختہ ہو پائے گا۔

سابق تصریحات سے حسب ذیل باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔

(۱) بدر کی لڑائی یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی آیت "وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ الخ" اس بارہ میں حجت قاطعہ ہے[۲]۔

(۲) یہودیوں کے نقض عہد کی وجہ مسلمانوں کی فتح مبین اور ان کے اغراض دنیہ کا تحفظ تھا۔ طبقات ابن سعد کی تصریح سابق اس بارے میں ناطق ہے اور اسی لیے قرآن نے انھیں شر الدواب سے موسوم کیا ہے۔

(۳) اعداء دین بالخصوص یہود و منافقین کی سرکوبی کے لیے مسلمانوں کو اسلحہ کی تیاری کے لیے اسی لیے ابھارا گیا ہے کہ جب تک وہ اندرونی فتنوں کا استیصال نہ کر لیں گے اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ آیت

---

[۱] ترجمان القرآن۔ "آخرین من دونھم" سے مراد یہود نہیں ہیں بلکہ ایسے دشمن ہیں جن کا حال مسلمانوں کو معلوم نہ تھا۔ یہود اور منافقین دونوں کے متعلق تو مسلمان بالیقین جانتے تھے کہ وہ دشمن ہیں۔

[۲] ترجمان القرآن۔ یہ سرے سے حجت ہی نہیں ہے قاطعہ تو درکنار۔

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ اَللّٰہُ یَعْلَمُھُمْ الخ فیصلہ کن ہے۔

ہمارے اس دعوی پر کہ بدر کی فتح مبین کے بعد یہودیوں نے کوئی نہ کوئی ضرور شرارت کی چند اور قرائن بھی ہیں مثلاً۔

(۱) کبھی کبھی اسلام کی عظمت و وقار کم کرنے کے لیے وہ مشرکوں سے کہتے مذہب میں مسلمانوں سے زیادہ تم ہی اچھے ہو۔

وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ (نساء) — اور وہ کافروں سے کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ راہ راست پر ہیں۔

(۲) اور کبھی کبھی مذہب اسلام کی عوام میں بے اعتباری پھیلانے کے لیے اسلام لا کر مرتد ہو جاتے تاکہ عوام مذہب اسلام سے متوحش ہوں ملاحظہ ہو۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْہَ النَّھَارِ وَاکْفُرُوْٓا اٰخِرَہٗ لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ (آل عمران رکوع ۸) — اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ مسلمانوں پر جو دین اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو شاید کہ یہ لوگ اسی طرح اس دین سے پھر جائیں۔

نظام سورہ سے استدلال | مولانا محترم نے خطاب کی وقت کے باب میں منجملہ اور وجوہ کے یہ بھی لکھا ہے کہ سورۂ انفال کے ساتویں رکوع سے خطاب یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے یا مسلمانوں کی طرف ہے اس لیے آیات مستفسر عنہا کا خطاب بھی مسلمانوں ہی کی طرف ہونا چاہیے۔ لیکن مولانا کا یہ دعوی

لہ ترجمان القرآن۔ یہ تینوں باتیں ثابت سہی۔ مگر اس سے آپ کے مدعا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے خطاب مسلمانوں کی طرف ہے اور انہیں دشمنوں سے خبردار کیا جا رہا ہے یہودیوں کی جانب کہیں خطاب نہیں۔

محتاج تفسیر ہے اس لیے ہم مضامین سورہ کی بلحاظ نظام نمبروار تقسیم کرتے ہیں؛ (۱-۴) ان آیات میں کامل مسلمانوں کے اعلام گنائے گئے ہیں یعنی حقیقی معنی میں ایمان کی دولت سے وہی بہرہ مند ہیں جن میں تقویٰ اصلاح ذات البین اور اطاعت اللہ والرسول کا جذبہ کارفرما ہو اور جن کے قلوب الحب فی اللہ و البغض فی اللہ سے سرشار ہوں یہی جذبہ تھا جس نے حق و باطل کی فیصلہ کن لڑائی میں چند نفوس کو دل بادل کے مقابل کھڑا کر دیا تھا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اس جذبہ میں کتنا اعجاز و سحر ہے اور اسی کا فقدان تھا کہ کچھ لوگ میدان میں آتے ہوئے ڈرتے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہی آیات (۵-۸) میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو باوجودیکہ صراحۃً جنگ کا حکم ہو گیا تھا، میدان جنگ میں اترتے ہوئے حیلے بہانے کر رہے تھے۔ اس کے بعد آیات (۹-۱۴) میں خدا نے غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں پر جو احسانات فرمائے ان کو بیان کیا ہے تاکہ کچے دلوں کے اندر توکل کی روح پیدا ہو اور باطل کی ظاہری طاقت سے (گو کہ بہت بڑھی چڑھی ہو) نہ دبیں اور ان کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو جائے کہ غلبہ حق ہی کو ہو گا گو کہ اس کے علمبردار مادی طاقت و قوت سے یکسر خالی ہوں۔ اس کے بعد آیات (۱۵-۱۹) میں مسلمانوں کو منجملہ اصول جنگ کے ایک نہایت ہی ضروری اصول کی تعلیم دی، یعنی یہ کہ صبر و استقامت کے بغیر جنگ ایک بے معنی شئے ہے۔ یہ روح جس جماعت کے اندر بھی پیدا ہو جائے گی اسباب آلٰہی اس کی تائید کریں گے اور اگر یہ چیز حزب اللہ کے اندر ہو تو پھر کیا کہنا ہے؟ آسمان و زمین سب کے سب اس کی تائید کریں گے، خدا کی بے پناہ تلوار اعدائے حق کے لیے خود چمکے گی۔ بدر میں کیا ہوا؟ اسی چیز کا ثمرہ تھا کہ خدا کی غیر مرئی افواج اعدائے اسلام کے مقابل میدان میں اتر پڑیں (فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ") اس کے بعد آیات (۲۰-۲۴) میں اطاعت کا ملہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہ چیز اس سورہ میں اصول جنگ کے سلسلہ میں آئی ہے اس لیے

ہم کہیں گے کہ اصول جنگ میں سے ایک نہایت ہی اہم دفعہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ لڑائی میں یہ قدم اول ہے اس کے بغیر جماعت بھیڑوں کا انبوہ ہوگی۔ جماعت کے مقدس لفظ کا اس پر اطلاق نہ ہوگا۔ تفصیل کے لیے سورۃ کو غور سے پڑھنا چاہیے اس کے بعد آیات (۲۴-۲۶) میں اسی دفعہ کی جو اس سے پہلے والے سلسلہ میں بیان کی تھی تشریح کر دی یعنی امیر کی ہر دعوت پر لبیک کہنا چاہیے ورنہ اعدار کے مقابل میں ٹکنا آسان نہیں اس کے بعد آیات (۲۷-۲۸) میں انفاق مال ونفس کی دفعہ بتائی گئی ہے۔ بظاہر یہ دفعہ بہت سخت ہے لیکن اسلام کی تو تعبیر ہی یہی ہے "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَمْوَالَھُمْ وَاَنْفُسَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا الخ) واقعہ یہ ہے کہ انسان سرًّا وجہرًا جو خیانت بھی کرتا ہے وہ دو ہی چیزوں سے متعلق ہوگی۔ یا تو مال سے یا جان عزیز سے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کیا معلوم کہ ان آیات میں انفاق مال ونفس کا مطالبہ کیا گیا ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ آیت "وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ وَّاَنَّ عِنْدَہٗ اَجْرٌ عَظِیْمٌ" جو اسی سلسلہ میں ہے معلوم ہوتا ہے اس کے بعد آیات (۲۹-۴۴) میں مسلمانوں کو فتح مکہ کی بشارت دی گئی ہے لیکن اسے مشروط قرار دیا ہے تقویٰ پر۔ یعنی جب یہ روح مسلمانوں میں زندہ ہو تو پھر ان کی راہ ترقی میں کوئی چیز بھی روک نہیں بن سکتی بلکہ موانع راہ خود اس کی اعانت کریں گے اور باطل قوتوں کے پرزے پرزے اڑ جائیں گے۔ چنانچہ بدر کی تازہ مثال نظروں کے سامنے ہے۔ اس کے بعد آیات (۴۵-۶۴) میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جنگ کے لیے نکلیں تو ان کی زبانیں اسمار الٰہی سے زمزمہ سنج ہوں۔ ایسا کیوں حکم دیا گیا؟ اس میں یہ راز ہے کہ ان کے اندر اعلاء کلمۂ حق اور ابطال باطل کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کا جینا اور مرنا حق کی خاطر ہو۔ نمود ونمائش کے لیے نہ ہو۔ اس کے بعد جب حزب اللہ کی تشکیل ہو چکی تو آیات (۶۵-۶۶) میں اعلان کر دیا کہ اگر دفعات مذکورہ کی روحانیت تمہارے اندر پیدا ہو گئی تو یقین کرو کہ چاہے تعداد میں تم کتنے ہی کم ہو، فتح وکامرانی تمہارے ساتھ ہوگی اور باطل کے علم کے نیچے گو کہ کتنی ہی بڑی بھیڑ ہو

تمہارے مقابل میں نہیں ٹک سکتی اور اگر تمہارے مقابل آئے گی تو پاش پاش ہو جائے گی۔ اس کے بعد آیات (۶۷-۷۱) میں چند شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے[1]۔ شبہات و جوابات ترتیب وار ذیل میں درج ہیں۔

(۱) نبی تو سراپا رحمت بن کر آتے ہیں لیکن یہ تو نبوت کے بھیس میں زمین کو خون سے رنگین کر رہا ہے بھلا نبی کی یہی شان ہوتی ہے۔

(۲) دیکھا توراۃ میں تو مال غنیمت کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن یہ نبی جائز کر رہا ہے[2]۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ اوپر کے سلسلہ کو مد نظر رکھکر ان آیات پر نظر ڈالنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ آیات کسی شبہ کو دور کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ جنگ بدر پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کی ایک اور کوتاہی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سورہ کی ابتدا میں ایک کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ۔ اس کے بعد دوسری کوتاہی یہ بتائی گئی کہ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ۔ اب تیسری کوتاہی پر توجہ دلائی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے دشمنوں کا زور توڑ دینے کے بجائے مال کی طرف نگاہ کی۔ اس موقع پر دخل مقدر ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ آیات کے سیاق و سباق اور ان کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جس طرح خطاب اوپر سے مسلمانوں کی طرف چلا آ رہا تھا اسی طرح یہاں بھی خطاب مسلمانوں ہی کی طرف ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ یہ تمام شبہات جو فاضل مضمون نگار نے بیان کیے ہیں انیسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے ہیں چھٹی صدی عیسوی کے کسی یہودی کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ "نبی سراپا رحمت بن کر آتے ہیں" یہ یہودی کا تخیل نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ کی زندگی کا نقشہ جو تورات میں ہے اور جنگ کی جو اسرائیلی روایات کتب مقدسہ میں موجود ہیں ان کو دیکھ لیجیے پھر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ زمین کو خون سے رنگین کرنے پر اعتراض کرنے والے اس دور کے یہودی ہو سکتے تھے یا انیسویں صدی کے مسیحی پادری؟ شبہ دوم بھی یہودیوں کے دماغ کی پیداوار نہیں ہے۔ ان کے دل میں اگر کوئی شبہ پیدا ہو سکتا تھا تو یہ کہ یہ نبی اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر رعایت کیوں کرتا ہے۔ جس قوم کے مذہبی احکام یہ ہوں کہ دشمن قوم کے کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑو اور اس کے تمام اموال پر قبضہ کر لو، کیا وہ قیدیوں سے فدیہ لینے پر اعتراض کر سکتی تھی؟ رہا شبہ سوم تو ہر شخص اس کو دیکھ کر اول نظر میں کہدیگا کہ وہ مسیحی تخیل ہے۔ پس واقعہ یہ ہے کہ ہمارے فاضل دوست جن شبہات کی بنا پر قرآن میں دخل مقدر مان رہے ہیں وہ گذشتہ صدی عیسوی میں بین الاقوامی قانون کے تصورات سے پیدا ہوئے تھے اور اب بیسویں صدی میں قانون جنگ کے عملی ارتقا سے خود بخود ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے بے بنیاد شبہات کے لیے اللہ تعالیٰ کو قطعاً دفع دخل مقدر کی ضرورت نہ تھی۔

ہم بھی تو آخر کتاب والے ہیں؟

(۳) اور انبیار تو دشمنوں سے پیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے لیکن اس نے تو ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا ہے، اس کے ظلم کی حد میدان ہی تک نہیں ختم ہوتی قیدیوں سے فدیہ بھی وصول کیا جاتا ہے یہ ظلم نہیں تو کیا ہے؟ تمھیں لوگ فیصلہ کرو۔

(۱) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ"۔ (۶۷-۶۸)	کسی نبی کے شایان شان یہ نہیں ہے کہ وہ قیدی کرے جب تک کہ ارض الٰہی کو لالہ زار کر دے تم متاع دنیا کے غلام ہو خدا کو تو آخرت مطلوب ہے اور خدا عزیز اور حکیم ہے اگر خدا کا قرار داد نہ گذر چکا ہوتا تو تمہاری حرکت پر عذاب الٰہی آکر تمہارا خاتمہ کر دیتا۔
(۲) فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"۔ (۶۹)۔	پس کھاؤ مال غنیمت حلال طیب سمجھ کر اور تقوی اختیار کرو ضرور خدا غفور اور رحیم ہے۔
(۳) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ"۔ (۷۰-۷۱)	اے نبی! کہدے ان قیدیوں سے جو تم لوگوں کے ہاتھوں میں قید ہیں کہ اگر خدا تمہارے دلوں میں صلاحیت پائے تو اس سے زیادہ بہتر چیز (دولت ایمان) دیگا جو تم سے لی گئی ہے (یعنی فدیہ) اور تمہاری لغزشات معاف کر دے گا! ور خدا بہت ہی مغفرت کرنے والا اور رحیم ہے اور اگر وہ تمہیں دہوکہ دیں گے تو یہ کوئی نئی

بات نہیں، اس سے پہلے بھی وہ خیانت کر چکے ہیں تو اس نے ان کو تمہارے قابو میں دیدیا اور اللہ علیم اور حکیم ہے۔

اس کے بعد آیات (۷۲ - ۷۵) میں حقیقی مسلمانوں کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں مال و جائداد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔

دیکھیے پیش نظر سورہ کی ابتدا اور اختتام کی آیات (۱ - ۴ - ۷۲ - ۷۵) میں بلحاظ نظم بہت کم فرق ہے۔ وہ یہ کہ ابتدائی آیات میں کلیات دین پر بہت زور دیا گیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ اور اختتام کی آیات میں لوازم ایمان بتائے ہیں۔ ایک لحاظ سے سورہ آیت (۶۵) پر ختم ہو جاتی ہے اور آیت (۶۶) آیۃ ناسخہ ہے اور آیات (۶۷ - ۷۱) دفع اعتراضات میں واقع ہیں۔

ایک ضروری اصول اس مقام پر ایک نہایت ضروری اصول بیان کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا وہ یہ کہ قرآن پاک کی جن آیات میں شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ انھیں چند قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے بعض تو ایسی ہیں جن کے سوالات مذکور ہیں اور سوال کے بعد ہی جواب دیا گیا ہے مثلاً یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَہِلَّۃِ قُلْ ہِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ۔ اور بعض دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں مثلاً وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْکُوْمٌ۔ پچھلے صفحات میں اس سے متعلق ہم بہت سے شواہد نقل کر چکے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور بعض آیات میں ایسے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جن میں پیغمبر اور مسلمانوں کے اعمال و منہاج پر اعتراض کیا گیا ہے مثلاً تحویل قبلہ کی بابت جب حکم آیا تو یہودیوں نے مسلمانوں کو اسلام کے خلاف ورغلایا ملاحظہ ہو:-

سَیَقُوْلُ السُّفَہَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا	ناسمجھ لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے ان کو اس قبلہ سے
وَلّٰىہُمْ عَنْ قِبْلَتِہِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْہَا	پھیر دیا جس پر وہ اس سے پہلے تھے؟ جواب میں
قُلْ لِّلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا	کہدو کہ اللہ ہی کا مشرق بھی اور مغرب بھی تم جس طرف

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ الآیۃ (بقرہ) بھی پھروگے اسی طرف اللہ ہے۔

تفصیل بالا سے وہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ اس طرح دخل مقدر محذوف ہوتا ہے تو کیوں نہ آیات مستفسر عنہا میں بھی دخل مقدر مان لیں جب کہ کوئی وقت بھی نہیں ہے۔ رہی ابن عباس اور دیگر مفسرین کی تصریح تو انشاء اللہ اگر ضرورت ہوئی تو اس کی تحقیق ہم آئندہ کریں گے۔

استدراک

از ایڈیٹر

دخل مقدر اور تبدیل خطاب ماننے کے لیے سب سے پہلے اس قاعدہ کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ کلام کو اس کے متبادر معنی سے پھیرنا صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ وہ معنی لینے سے کوئی قباحت واقع ہوتی ہو۔ اگر کسی قباحت کے بغیر اس کے متبادر معنی لیے جا سکتے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ ایک دخل مقدر فرض کریں اور الفاظ کو سیدھے سادے مفہوم سے پھیر کر بعید اور بعید تر تاویلات کی طرف لے جائیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آیات زیر بحث کا صریح اور متبادر مفہوم تو وہی ہے جو ہر شخص اول نظر میں سمجھتا ہے اور وہی مفہوم ۱۳ سو برس تک تمام مفسرین اور مترجمین قرآن سمجھتے رہے ہیں قبل اس کے کہ آپ اس مفہوم کو چھوڑ کر کوئی دخل مقدر فرض کریں آپ کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ اس متبادر مفہوم میں فی الواقع کوئی قباحت ہے۔ آپ جو قباحت بیان فرماتے ہیں ہم کو اس کے قباحت ہونے ہی میں کلام ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی یہ پوری بحث جو ایک خاص دخل مقدر کی تائید میں آپ نے تحریر فرمائی ہے، قبل از وقت ہے۔ پہلے آپ معنی متبادر کی قباحت ثابت کیجیے۔ اس کے بعد یہ سوال زیر بحث آ سکتا ہے کہ صحیح معنی متعین کرنے کے لیے کونسا دخل مقدر مانا جائے اور کس کو ان آیات کا مخاطب قرار دیا جائے۔

آپ نے قرآن مجید سے دخل مقدر کی جتنی مثالیں بیان فرمائی ہیں وہ سب ایسی ہیں کہ آیات کو ان کے صریح اور عام فہم معنی سے پھیرتی نہیں ہیں بلکہ اسی معنی کی مزید توضیح کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس قسم کے دخل مقدر سے خالی الذہن ہو تب بھی وہ آیات کا ایک سیدھا سادھا مفہوم سمجھ سکتا ہے، اور دخل مقدر ماننے والا اُس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو نے ان کا بالکل غلط مفہوم سمجھا ہے۔ اس طرح کا دخل مقدر ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر اس پر قیاس کرکے ایسے دخل مقدر کو جائز ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے جس کو ماننے سے آیات اپنے صریح معنی سے پھر جاتی ہوں۔

مزید براں آپ کی پیش کردہ مثالوں میں جتنے دخل مقدر بیان کیے گئے ہیں وہ یا تو خود قرآن میں کہیں نہ کہیں مذکور ہیں، یا قرآن سے باہر کسی نہ کسی جگہ ان کا ذکر آیا ہے، اور ہر شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ تحقیق کرکے ان کا پتہ لگالے۔ بخلاف اس کے یہ خاص دخل مقدر جسے آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں، نہ قرآن میں مذکور ہے نہ کسی اور جگہ۔ اس کا پتہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جس کے دل میں وہی بات کھٹکے جو آپ کے دل میں کھٹکی ہے، اور جس کا طریق فکر وہی ہو جو آپ کا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ دخل مقدر کہیں باہر موجود نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص قسم کے ذہن کی پیداوار ہے جس شخص کا ذہن اس خاص قسم کا نہیں ہے، وہ قیامت تک اس دخل مقدر کا پتا نہیں لگا سکتا، بلکہ اس کے دل میں شائد اس کی جستجو کا خیال بھی نہیں آسکتا ہیں۔ یہ بات کسی مبالغہ کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ آج تک جن لوگوں نے قرآن کی تفسیر اور ترجمہ کیا ہے ان میں سے کسی کا ذہن اس دخل مقدر تک نہیں پہنچا، اور جو لاکھوں کروروں انسان اس کتاب پاک کی تلاوت کرتے ہیں ان میں بھی شائد ہی کسی کی رسائی وہاں تک ہوئی ہو۔ پھر کیا قرآن ایک معما اور چیستاں ہے کہ اس کے فہم کے دروازے عام انسانوں پر بند ہیں؟ اور کیا اس کی آیات ایسی گنجلک ہیں کہ ان کے معانی سمجھنے کے لیے دور دور سے دخل مقدر تلاش کرکے لانے کی ضرورت ہے؟

آپ نے تبدیل خطاب کی بھی بہت سی مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ مگر آپ خود ان مثالوں پر غور

فرمائیے۔ ان میں ہر جگہ تبدیل خطاب بالکل فطری انداز بیان میں ہوئی ہے۔ ایک عامی ان کو پڑھ کر آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ کس جگہ کون مخاطب ہے بخلاف اس کے آیات زیر بحث میں جو تبدیل خطاب آپ تجویز فرما رہے ہیں وہ ایک عامی تو درکنار علماء کے فہم سے بھی بعید ہے۔ کوئی قرینہ ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ مسلمانوں سے خطاب کرتے کرتے دفعتہً یہودیوں کی طرف کہاں خطاب پھر گیا اور پھر مسلمانوں کی طرف کہاں راجع ہو گیا۔ اس قسم کی تبدیل خطاب کی کوئی مثال ہمیں قرآن میں نہیں ملتی۔

آپ نے نظام سورہ سے بھی استدلال فرمایا ہے مگر آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ نظام سورہ سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اس طریق استدلال کو چھوڑ کر اگر آپ ترتیب نزول اور نظام سورہ دونوں سے مدد لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آیات زیر بحث کا صحیح مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے اور جس کو عام طور پر قرآن کے مفسرین و مترجمین نے سمجھا ہے۔ سب سے پہلے سورہ محمدؐ کی ابتدائی آیات پڑھیے روایات سے قطع نظر، خود قرآن کی اندرونی شہادت سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آیات ہجرت کے بعد اور جنگ سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ ان میں ارشاد ہوا ہے:۔

"جن لوگوں نے دین حق کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکا، اللہ نے ان کے اعمال کو رائگاں کر دیا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اس ہدایت کو جو محمد پر نازل ہوئی ہے مان لیا کہ وہی ان کے رب کی طرف سے برحق ہے اللہ نے ان کے گناہ اُن پر سے اتار دیے اور ان کی حالت درست کر دی۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کا اتباع کیا اور ایمان لانے والوں نے اُس حق کا اتباع کیا جو ان کے رب کی طرف سے ہے۔ اس طرح اللہ ان دونوں گروہوں کو لوگوں کے لیے مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پس اے مسلمانو! جب تمہاری مڈبھیڑ ان کافروں سے ہو تو پہلے گردنیں مارنا پھر جب ان کا زور اچھی طرح توڑ دو

تو قید کر لینا، اس کے بعد تمہیں اختیار ہے خواہ احسان سے پیش آؤ خواہ فدیہ لے کر چھوڑ دو، حتیٰ کہ
جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہ ہدایت تم کو دی جاتی ہے۔ اگر خدا چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا
(تمہارے لڑنے کی نوبت ہی نہیں آتی مگر یہ (لڑائی کا طریقہ) اس لیے ہے کہ وہ تم میں سے ایک کو
دوسرے کے ساتھ آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں گے اللہ ان کے
اعمال کو رائیگاں نہ کرے گا۔ وہ انہیں منزل مقصود کو پہونچا دے گا اور ان کا حال درست
کرے گا اور اس جنت میں انھیں داخل کرے گا جس سے وہ پہلے ہی ان کو روشناس کرا چکا ہے۔
اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے کام آؤ گے تو اللہ تمہارے کام آئے گا اور تمہیں ثابت قدم
بنا دے گا۔ اور جو لوگ کافر ہیں ان کے لیے ہلاکت ہے، اللہ نے ان کے اعمال کو رائگاں کر دیا
یہ اس لیے کہ انھوں نے پسند نہ کیا اُس ہدایت کو جو اللہ نے نازل کی ہے۔ لہذا اللہ نے
ان کے عمل اکارت کر دیے۔ کیا انہوں نے زمین میں سیر و سفر کر کے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے
جو قومیں گذر چکی ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟ اللہ نے ان کو تہس نہس کر دیا اور ایسا ہی کچھ
دوسرے کافروں کو بھی پیش آنا ہے ...... کتنی ہی بستیاں تھیں جن کے باشندے اُس
بستی کے باشندوں سے بہت زیادہ بل بوتا رکھتے تھے جس کے لوگوں نے اے پیغمبر تجھ کو گھر سے
نکالا ہے ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور کوئی انکا مددگار نہ کھڑا ہوا" (سورۂ محمد رکوع اول و دوم)

اس عبارت اور خصوصاً اس کے خط کشیدہ فقروں پر غور کیجیے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ
ابھی شروع نہیں ہوئی ہے، مسلمان ابھی نئے نئے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ اب دوسری اور زیادہ سخت
گھاٹی کی طرف بڑھنے کے لیے ان کو تیار کیا جا رہا ہے۔ ان کے نفوس میں وہ خاص طاقت پیدا کرنے کی
کوشش کی جا رہی ہے جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ صرف خدا کے لیے لڑنے والے مجاہدین کے نفوس میں ہونی چاہیے
اس کے ساتھ ہی ان کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ دیکھو! لڑائی کے موقع پر اپنی تمام توجہ کفار کا زور

توڑنے کی طرف صرف کرنا۔ مال کی طرف توجہ نہ کرنا۔ اپنا کام پورا کر لینے کے بعد تم قیدی بھی پکڑ سکتے ہو اور ان سے فدیہ بھی لے سکتے ہو۔ لیکن چونکہ تمہاری جنگ حق کے لیے ہے، متاعِ دنیا کے لیے نہیں ہے، اس لیے کفر کی کمر توڑنے سے پہلے مال لینے کا خیال بھی نہ کرنا۔

اس کے بعد جنگ بدر پیش آتی ہے۔ تاریخ میں پہلی جنگ تھی جو بالکل ایک نرالے مقصد اور بالکل نئے اصولوں کے تحت لڑی جا رہی تھی۔ عرب تو کیا، دنیا کی کوئی قوم بھی اس وقت تک ایسی جنگ سے واقف نہ تھی جس میں کسی دنیوی غرض کا قطعاً کوئی لگاؤ نہ ہو۔ جس میں بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا اور رشتہ دار سے رشتہ دار صرف اصول کی خاطر لڑنے کے لیے نکلا ہو۔ صحابہ کرام اگرچہ کئی سال سے ایسی نفسی تربیت پا رہے تھے جو ان کو اس خاص قسم کی لڑائی کے لیے تیار کرنے والی تھی۔ مگر ابھی تک عملی امتحان نہیں ہوا تھا۔ خود سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی اس نئی اور بالکل نرالی جنگ کی قیادت کا پہلا موقع تھا۔ ایسی حالت میں بالکل ایک فطری بات تھی کہ جنگ میں صحابہ سے کچھ نہ کچھ لغزشیں سرزد ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ کے مقصد کو پورا کرنے میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں باقی رہ جاتیں۔ چنانچہ ایسا ہوا جس کی شہادت قرآن اور تاریخ دونوں سے ملتی ہے۔

جنگ کے بعد، اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال نازل کی۔ چونکہ اس فوج کا اصلی جنرل خود اللہ تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم محض اس کی ہدایت کے تحت اس کے نائب کی حیثیت سے کمانڈ کر رہے تھے، اس لیے لڑائی ختم ہونے کے بعد جنرل نے لڑائی پر تبصرہ کیا اور اس تبصرہ میں ایک طرف یہ بتایا کہ تمہارے دشمنوں کی اصل کمزوریاں کیا تھیں جنہوں نے ان کو ناکام کیا اور تمہاری طاقت کے اصل اسباب کیا ہیں جن کی بدولت تم فتحیاب ہوئے اور آئندہ بھی فتحیاب ہو سکتے ہو۔ دوسری طرف اس نے وہ کوتاہیاں بھی بتائیں جو اس کی فوج اور اس کے جلیل القدر نائب سے رہ گئی تھیں، تاکہ دوسری لڑائیوں کے موقع پر ان سے اجتناب کیا جائے۔

جنگ کے بعد مسلمانوں کے دل میں پہلی فکر یہ پیدا ہوئی کہ یہ اموال غنیمت جو ہاتھ آئے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ جو دل کے چھپے ہوئے بھیدوں سے واقف تھا، اس نے سب سے پہلے اسی چوری کو پکڑا۔ وہ ان لوگوں کو ایسی جنگ کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا جس میں دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس لیے اس نے مال کی اس دبی چھپی طلب کو بھی مٹا دینا چاہا جو اس کی فوج کے دل میں راہ پا رہی تھی۔ اس نے فرمایا:-

"یہ لوگ مال غنیمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ مال غنیمت تو اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ تم اللہ سے ڈر کر پرہیزگاری اختیار کرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو (کہ مال کی محبت میں ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے حسد نہ پیدا ہو) اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو"

(سورۂ انفال۔ آیت اوّل)

جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہایت بے سروسامانی کی حالت میں جنگ کے لیے نکل رہے تھے تو مجاہدین میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کے دل چھوٹے جاتے تھے اور ہمت پست ہوئے جا رہی تھی۔ غریب الدیار تھے۔ روٹی اور کپڑے تک کو محتاج تھے۔ جنگ کے لیے پورے ہتھیار تک نہ رکھتے تھے۔ اور دیکھ یہ رہے تھے کہ ہم مٹھی بھر آدمیوں کو صرف قریش سے نہیں بلکہ تمام عرب سے لڑایا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں دل شکستہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ ضعف ایمانی کی وجہ سے ان میں کمزوری پیدا ہوئی تھی، اس لیے ان کو اس کمزوری اور اس کے سبب دونوں کی طرف متوجہ کیا اور انہیں ایسی تعلیم دی کہ ان کے نفس میں طاقت پیدا ہو۔ فرمایا:-

"مومن تو وہ ہیں کہ ان کے سامنے جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھیں اور جب خدا کی آیات ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان اور زیادہ

بڑھ جائے۔ سچے مومن وہی ہیں جو ہر حال میں صرف خدا پر بھروسہ رکھیں، نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے ہماری راہ میں خرچ کردیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اپنے رب کے ہاں بڑے درجے ہیں، گناہوں کی معافی ہے، عزت کی روزی ہے۔ جس طرح تیرے رب نے تجھے حق کی خاطر لڑنے کے لیے گھر سے نکالا تو مومنین میں سے ایک گروہ دل میں راضی نہ تھا۔ وہ حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی تجھ سے جھگڑ رہے تھے (کہ جنگ کیلیے جائیں یا نہ جائیں)، ان کا حال ایسا تھا کہ گویا آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں"۔ (سورۂ انفال رکوع اول)۔

جنگ بدر کے موقع پر ایک طرف سے قریش کا تجارتی قافلہ مال کثیر لیے ہوئے آ رہا تھا اور دوسری طرف سے قریش کی فوج چلی آ رہی تھی۔ مسلمانوں میں سے ایک بڑی جماعت چاہتی تھی کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے تاکہ آسانی سے اس کو شکست دیکر مال حاصل کیا جا سکے۔ یہ بھی ایک کمزوری تھی جو اسلامی جہاد کی اصلی غرض اچھی طرح ذہن نشین نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تبصرہ میں اس پر بھی تنبیہ فرمائی۔

"اور جب اللہ نے تمہارے سامنے دو گروہوں کو پیش کیا کہ ان میں سے کوئی ایک گروہ تمہارے ہاتھ آ جائے گا، تو تم چاہتے تھے کہ جو گروہ لڑائی کی طاقت نہیں رکھتا وہ تمہارے ہاتھ آ جائے۔ مگر اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق مضبوط بنیاد پر قائم ہو جائے اور باطل، باطل ہو کر رہ جائے، خواہ مجرمین اس پر راضی نہ ہوں"۔ (سورۂ انفال رکوع اول)۔

دوران جنگ میں جب کفار شکست کھا کر بھاگنے لگے تو مسلمان عرب کی قدیم عادت کے مطابق کفار کا پیچھا چھوڑ کر غنائم کی طرف جھک پڑے اور چند قیدیوں کو پکڑ کر مال غنیمت لیے ہوئے مدینہ کی

طرف فاتحانہ واپس ہو گئے پھر مدینہ پہنچ کر صحابہ کے مشورہ سے حضورِ اکرمؐ نے فدیہ بھی قبول کر لیا اور انھیں چھوڑ دینے کا تصفیہ کیا۔ یہ فعل اگرچہ اس اجازت کے مطابق تھا جو سورہ محمدؐ میں قبول فدیہ کی بابت دی گئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو شرط لگائی تھی کہ قیدیوں کو گرفتار کرنے اور فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دینے سے پہلے کفار کا زور توڑنا ضروری ہے، اس شرط کی تکمیل میں کوتاہی کی گئی۔ اس پر حق تعالیٰ اپنی فوج کے سپاہیوں اور خود اپنے نائب کو اس طرح تنبیہ فرماتا ہے:۔

"کسی نبی کو یہ سزاوار نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں تاوقتیکہ وہ زمین میں (کافروں) کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگوں کے پیش نظر دنیا کے فائدے ہیں۔ مگر اللہ کے پیش نظر آخرت ہے، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اگر اس سے پہلے خدا کی اجازت نہ آچکی ہوتی تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر سخت عذاب تمھیں آگھیرتا۔ خیر اب جو مال غنیمت تم حاصل کر چکے ہو وہ حلال اور پاک ہے، اسے کھاؤ پیو اور اللہ سے ڈرتے رہو وہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورۂ انفال رکوع ۹)۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات سمجھ لیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس بات پر تنبیہ کی گئی ہے وہ صرف پہلے فقرے میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی آپ کو صرف اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اے نبی تم نے اثخان فی الارض کی شرط جو لگائی تھی اس کو تم نے پورا نہیں کیا اور اس کی تکمیل کیے بغیر قیدی پکڑ بھی لیے اور ان سے فدیہ بھی قبول کر لیا! اس کے بعد دوسرے فقرے میں عام مجاہدین کو چشم نمائی کی گئی ہے کہ تم ہماری ہدایت کے خلاف غنیمت پر کیوں جھک پڑے، حالانکہ تم کو سمجھا دیا تھا کہ تمہاری جنگ دنیا کے لیے نہیں ہے بلکہ آخرت کے لیے ہے۔ اس فقرہ میں صیغۂ جمع کیساتھ خطاب کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ مسلمان ہیں، اور یہ شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس سے حضورؐ پر دنیا طلبی کا الزام آتا ہے۔

اقتباسات

التزامِ جماعت

مسلمانوں کے لیے ایک اور صرف ایک راہ عمل

ماخوذ از "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" تالیف مولانا ابوالکلام آزاد

"ان صفحات میں کئی مہینہ سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ ان کے لیے جمعیت اور جماعت کے بغیر کوئی زندگی نہیں ہے اور یہ انفرادیت و انتشار کی زندگی جو وہ بسر کر رہے ہیں درحقیقت جاہلیت کی زندگی ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ جماعت کے بغیر وہ خواہ کسی طرف جائیں، انہیں کوئی کامیابی میسر نہیں آسکتی۔ اگر وہ اسلام سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں تو جس جہنم کی طرف چاہیں چلے جائیں۔ لیکن اگر اسلام کا اتباع کرنا چاہتے ہیں تو اس کی تعلیم ہمیشہ سے یہی ہے اور ہمیشہ یہی رہے گی کہ سب کاموں سے پہلے ان کو جماعت بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس باب میں ہمارا خیال تھا کہ اسلام کی تعلیمات کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں۔ مگر یاد آیا کہ اس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۲۰ء میں انہی تعلیمات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، اور انہی کو دوبارہ شائع کر دینا ہمارے مقصد کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ذیل میں اس تحریر کے ضروری اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل کے دروازے کھول کر ان کو پڑھے۔ یہ دین اسلام کے محکمات ہیں

جن کی بنیادیں فطرت کے اٹل قوانین پر رکھی گئی ہیں۔ اشخاص بدل جاتے ہیں مگر حقائق اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ جو چیز ہبوط آدم کے وقت حقیقت تھی وہی اب ساڑھے تیرہ سو برس پہلے حقیقت تھی اور سترہ برس پہلے بھی اب بھی حقیقت ہے اور قیام قیامت تک حقیقت ہی رہے گی)۔

اجتماع و ائتلاف اور اشتات و انتشار: نہ صرف امت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کی موت وحیات ترقی وتنزل اور سعادت وشقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔

اجتماع کے معنی ہیں ضَمُّ الشئ بتقریب بعضہ من بعض (مفردات امام راغب[95]) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہوجانا۔

اور ائتلاف "الف سے ہے اس کے معنی ہیں ما جمع من اجزاء مختلفۃ در تب ترتیبا قدم فیہ ما حقہ ان یقدم واخر فیہ ماحقہ ان یوخر (مفردات: ۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہوجانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ اسے ملے جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے۔ جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے وہ آخری جگہ پائے۔

پس اجتماع و ائتلاف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت، اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب کے ساتھ اکٹھی ہوجاتی ہیں، اور تمام مواد، قوٰی، اعمال، اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہوجاتا ہے، بلکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہمد گر جڑا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متصل و متحد ہوجاتا ہے۔ کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی۔ انتشار، اور الگ الگ، جزجز، فرد فرد ہوکر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہوجاتا ہے تو اسی سے تخلیق و تکوین اور وجود و ہستی کے تمام

مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبۂ "تخلیق" و "تسویہ" سے بھی تعبیر کیا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ (۸۶ : ۲) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع و ائتلاف اور موت و فنا نہیں ہے مگر اس کی ضد ہے۔ یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو "خیر" اور شریعت کی زبان میں "عمل صالح" اور "حسنات" کہتے ہیں۔ جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں "تندرستی" سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے یہ "زندگی" ہے۔ اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام "حیات قومی و اجتماعی" ہوتا ہے۔ اور اس کا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں معنی ایک ہے۔ مظاہر گو مختلف ہیں، مگر اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح اس کا قانون حیات و وجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے ؛ و لنعم ما قیل ؎

عباراتنا شتی وحسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر

اس حالت کی ضد "اشتات و انتشار" ہے۔ اشتات، شتت سے ہے جس کے معنی لغت میں "تفریق" اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یقال شت جمعھم شتا و شتاتا وجاؤا اشتاتا ای متفرقی النظام (مفردات : ۲۵۶) قرآن حکیم میں ہے یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا (۶:۹۹) اور مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی (۲۰ : ۵۳) اور وَّقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی (۵۹ : ۱۴) ای مختلفۃ۔

انتشار، نشر سے ہے اس کے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی تفرق کے۔ سورۂ جمعہ میں ہے فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا۔ یعنی تفرقوا۔

اشتات و انتشار سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جانے

متفرق و پراگندہ ہونے اور باہمدگر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جائے۔ موادیں، قوی میں، اعمال میں، افرادیں، ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادّہ پر طاری ہوتی ہے تو "تکوین" کی جگہ "فساد" اور "وجود" کی جگہ "عدم و فنا" کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام پہلے "بیماری" اور پھر "موت" ہے۔ اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں "عمل سوء" اور "عصیان" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہو جاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تنزل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی، اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا "اجتماع و ائتلاف" کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اس لیے انسان کے لیے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اس کو "اعتصام بحبل اللہ" اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اولین مادۂ تکوین امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کرکے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا:-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ (۳: ۱۰۲)

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ سب اسی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے تم سرفراز کیے گئے؟ تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقا و قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ ہلاکی کی ایک آگ ہے

جس کے دھکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی زندگی نشوونما نہیں پا سکتی۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ (۳: ۱۰۳)

اور تمہارا حال یہ تھا کہ آگ کے دھکتے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اپنے فضل و رحمت کی نشانیاں اسی طرح کھولتا ہے تاکہ کامیابی کی راہ پا لو۔

یہ بھی جا بجا بتلا دیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح و حقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دے۔

وَلَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۸: ۶۹)

اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان بکھرے ہوئے دلوں کو محبت و اتحاد کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے جس نے تفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا۔

اور اسی لیے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع و ائتلاف پیدا ہو، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور اسی لیے نتیجہ شریعت سے بغی و عدوان اور اس کو بالکل ترک کر دینے کا ہے فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ (۱۳: ۹۲)۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۵: ۱۶) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (۳: ۱۰۴)

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور "حیاۃ جاہلی" سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا: من فارق

الجماعۃ فمات، فمیتۃ جاھلیۃ[1]۔ وغیر ذالک۔ اور اسی بنا پر بکثرت وہ احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا، اگرچہ امیر غیر مستحق ہو، نا اہل ہو، ظالم ہو، کوئی ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو، اور نماز قائم رکھے (ما اقاموا الصلوٰۃ)۔ اور ساتھ ہی تبلا دیا گیا کہ جس شخص نے علیحدگی کی راہ اختیار کی تو اس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالہ کر دیا یعنی گمراہی اور ٹھوکر اس کے لیے ضروری ہے۔ زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے، لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہو گئی ہو تو ایک چھوٹے سے حلقے کا حکم رکھتی ہے جس کو انگوٹھے سے مسل دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذہ وھو من الاثنین ابعد۔ دوسری روایت میں ہے فان الشیطان مع الواحد۔ یعنی جماعت سے الگ نہ ہو۔ ہمیشہ جماعت بن کر رہو۔ کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا۔ دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور ہے یعنی اتحادی و جماعتی قوت ان میں پیدا ہو گئی اب وہ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتے۔ یہ الفاظ مشہور خطبۂ جابیہ کے ہیں جو عبد اللہ بن دینار، عامر بن سعد، سلیمان بن یسار وغیرہم سے مروی ہے اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی علیکم بالسواد الاعظم[2] اور فانہ من شذ شذ فی النار[3] اور ید اللہ علی الجماعۃ[4] اور لا یجمع اللہ امتی علی الضلالۃ[5] او کما قال۔ اور خطبۂ حضرت امیر کہ ایاکم والتفرقہ

---

[1] جو شخص جماعت سے علیحدہ ہو گیا اور اسی حال میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔
[2] تم پر لازم ہے کہ قوم کے سواد اعظم کا ساتھ دو۔
[3] جو جماعت سے چھٹ کر الگ ہو گیا اس نے دوزخ کی راہ لی۔
[4] اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔
[5] اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔

فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب۔ الا من دعا الی ھذا الشعار فاقتلوہ ولو کان تحت عمامتی ھذہ[1]، وغیر ذٰلک اس سے یں معلوم و مشہور ہیں۔ آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو۔ جو جماعت سے الگ ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ افراد تباہ ہوسکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہوسکتی۔ اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اللہ کبھی ایسا نہ ہونے دیگا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہوجائے۔

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نا اہل ہو لیکن پھر بھی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا، حتی کہ صلوا خلف کل بر و فاجر[2] تو اس میں بھی یہی حقیقت مضمر ہے کہ زندگی جماعتی زندگی ہے۔ انفراد و فرقت ہر حال میں بربادی و ہلاکت پس جماعت سے ہر حال میں باہر نہ ہونا چاہیے۔

اور یہی سبب ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھائی گئی، اس میں متکلم واحد نہیں بلکہ جمع، حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ فرمایا، اھدنی نہیں کہا گیا۔ یہ اسی لیے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے، ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے، اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو۔ اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان و خلاصۂ قرآن و عصارۂ اسلام ہے، متکلم جمع کا صیغہ آیا نہ کہ واحد کا۔ اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت

[1] خبردار! پراگندہ و منفرق نہ ہوجانا، اس لیے کہ جماعت سے الگ اکیلا انسان شیطان کا حصہ ہے جس طرح ریوڑ سے الگ اکیلی بکری بھیڑیے کا حصہ ہے۔ جو شخص اس شعار کی دعوت دے اس کو قتل کردو خواہ وہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو۔

[2] ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھ لو۔

جو امتیازی دعا سکھلائی گئی، وہ بھی بہ صیغۂ جمع آئی، اگرچہ مخاطب واحد ہو یعنی "السلام علیکم" السلام علیک نہیں قرار دیا گیا۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کے لیے بھی السلام علیکم بصیغۂ جمع رکھا گیا واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔ علت اس کی یہی ہے، نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی۔

اور اسی بنا پر احکام و اعمال شریعت کے ہر گوشہ اور ہر شاخ میں یہی اجتماعی و ائتلافی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے۔ نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے۔ حج بجز اجتماع کے اور کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال و اندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دے دینا ہے علاوہ بریں اس کی ادائگی کا قیام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بدقسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے، بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفۂ وقت کے سپرد کر دے۔ پس اس کے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اس کا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوصہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو، اسی کو ترجیح دے۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود ضروری نہ تھا تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا۔

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت[1] کی تصویر کھینچی گئی ہے، مثل المومنین فی توادھم و تعاطفھم

[1] مسلمانوں کی یہی متحدہ قومیت ہے جس کی جڑیں آج کاٹی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ "مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے" (ملاحظہ ہو پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح حیات۔ ترجمہ اردو۔ جلد دوم ۳۳۲) ان کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ تمہاری کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے محض ڈاڑھی اور پیجامہ اور ٹونٹی دار لوٹا تمہاری تہذیب کی ایک سطحی علامت ہے اور یہ امتیاز بھی اب مٹنے کو ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۳۳۵) یہ صرف ایک

ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸

کمثل الجسد الواحد اذا اشتکٰی منہ عضو تداعٰی لہ سائر الجسد بالسہر والحمّٰی (صحیحین) اور المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضہ بعضاً (بخاری) یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسی ایک جسم اور اس کے مختلف اعضا۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے، اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔ اور ان کی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی ہے اور سہارا دیتی ہے۔ پھر تشبیک اصابع کر کے اس کی تصویر بتلا دی، یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلا دیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے۔ دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ ہے تو اجتماعی وجود ہے یعنی دیوار کا ایک جز ہے اور انہی اجزار کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے[1]

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسویۂ صفوف پر سخت زور دیا گیا، یعنی صف بندی پر، اور سب

تتمہ صفحہ ۱۲۷ فرد کے خیالات نہیں ہیں بلکہ ایک پوری جماعت مسلمانوں کے دماغوں سے متحدہ اسلامی قومیت کا تخیل نکال دینے کے لیے باقاعدہ تبلیغ کر رہی ہے اور خود مسلمانوں کے بعض افراد سے یہ کام لیا جا رہا ہے (ملاحظہ ہو ڈاکٹر اشرف کے وہ مضامین جو اسلامی اخبارات میں دھڑلے کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں) اور حیرت یہ ہے کہ جو لوگ ہماری متحدہ قومیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے وہ آج اسی جماعت کے شریک کار ہیں جو اس قومیت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے یہ استیصال کا عمل ہو رہا ہے اور وہ خاموش ہیں، صرف خاموش ہی نہیں بلکہ اپنی شرکت سے اس عمل کی توثیق کر رہے ہیں، صرف توثیق پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ فرد فرد بن کر اسی جماعت میں شامل ہو جائیں جو ایک ہاتھ سے برطانوی امپیریلزم پر حملہ کرتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے ہاتھ سے اسلامی قومیت کی جڑوں پر بھی کلہاڑی مارتی ہے۔ کاش اب بھی ہمیں بتایا جاتا کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ میں اس طرز عمل کے لیے کونسی سند ہے۔ ترجمان القرآن

[1] عمارت اسلامی کی یہ اینٹیں اس وقت متفرق ہیں۔ ایک جماعت چاہتی ہے کہ ان اینٹوں کو غیر مسلم اینٹوں کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹

کے سروں سینوں اور پاؤوں کے ایک سیدھ میں ہونے پر لتسون صفو فکم او لیخالفن اللہ بین وجو ھکم (بخاری) اور روایت انس کہ سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ (بخاری) وفی لفظ تمام الصلوٰۃ، تو اس میں بھی یہی بھید ہے اور تشریح کا یہ موقع نہیں۔

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب طبع ثانی ص ۱۳۴تا ۱۴۱)

مرکزیت اور التزام جماعت کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت وسنت ایک خاص نظام پر کارفرما ہے جس کو "قانون مرکز" یا "قانون دوائر" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی قدرت نے خلقت ونظام خلقت کے بقا وقیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمنزلہ مرکز کے ہوتا ہے اور بقیہ اجسام ایک دائرہ کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں اور پورے دائرہ کی زندگی اور بقا صرف اسی مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی دائرے کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں یا مرکز کی اطاعت وانقیاد سے باہر ہو جائیں تو معاً نظام ہستی درہم برہم ہو جائے اور دائرے کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم وباقی نہ رہ سکیں یہی وہ حقیقت ہے جس کو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا کہ الحقیقۃ کا لکرۃ اور صاحب فتوحات نے کہا کہ "دائرہ قاب قوسین" ہے۔

یہ قانون مرکزیت ودوائر نظام ہستی کے ہر جزو اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

بقیہ حاشیہ ص ۱۲۸ اس کے مقابلہ میں ہم چاہتے ہیں کہ ان اینٹوں کو اسلامی جمعیت کے مسالے سے جوڑ کر ایک دیوار بنا دیا جائے پھر دیوار کی دیوار اپنی اجتماعی ہیئت میں وطنی عمارت کا ایک متقل جزبن سکتی ہے سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان جو کتاب وسنت کی ان تصریحات اور اس واضح شدہ حقیقت سے واقف ہے، اس کو ان دونوں طریقوں میں سے کس کا ساتھ دینا چاہیے (ترجمان القرآن)۔

یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے، ستاروں کی یہ گنجان آبادی، کروں کا یہ صحرائے بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم کیا ہے؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے؟ اسی قانون مرکزیت پر۔ متحرک سیاروں کے حلقے اور دائرے ہیں، ہر دائرہ کا نقطۂ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے تمام ستارے اپنے اپنے کعبۂ مرکز کا طواف کر رہے ہیں، اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکزِ شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے: ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔ خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرے کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے ہر ستارے کے طواف و دوران کے لیے حکمت الٰہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دے دیا ہے وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ سب بحکم وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ (۲۲: ۱۹) خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۳۶: ۴۱)۔

قانون مرکزیت کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اترتے آئیں گے اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لیکر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے، ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو۔ اس کی مجموعہ وحدت کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے؟ ڈالیاں ہیں۔ شاخیں ہیں، پتے ہیں، پھول ہیں لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی موت و فنا اس پر طاری ہو گئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم النفس کی طرف آؤ۔ خود اپنے وجود کو دیکھو جسے دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے جو تم میں آباد ہے۔ ہر جسم کا ایک فعل ہے اور ایک خاصہ۔ لیکن دیکھو! یہ ساری آبادی کس طرح

ایک ہی مرکز کے آگے سربسجود ہے؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے۔ اس سے الگ رہ کر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَتِ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَتِ الْجَسَدُ كُلُّهُ (بخاری)۔

اسلام فی الحقیقت سنۃ اللہ اور فطرۃ اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نوع انسانی کی سعادت وارتقار کے لیے قانون اسلام اسی فاطر السموٰت والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کیلیے قانون حیات بنایا، تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو بلکہ پہلا قانون پچھلے قانونِ عام کا ایک ایسا قدرتی جزو نظر آئے جیسے زنجیر کی ایک کڑی۔ پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزیت پر قائم ہوا۔ قرآن نے یہ حقیقت جابجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیار کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے، اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقار بھی قانون مرکزیت پر موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے، اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیار کرام کا وجود ہے۔ پس ان کی اطاعت و اتباع و بقار وحیات کے لیے ناگزیر ٹھیری۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴ : ۶۸) دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اسی لیے فرمایا۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴ : ۶۹) اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ پھر قوم وملت کے بقار کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدۂ توحید کو ٹھیرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴ : ۵۲)۔ عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھیرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرۂ عمل منہدم ہو جاتا ہے فَمَنْ اَقَامَهَا اَقَامَ الدِّيْنَ

وَمَن ترکھا فقد ھدم الدین - اور اسی لیے یہ بات ہے کہ کانَ اصحاب رسول اللہ صلعم لایرونَ شیئاً مِن الاعمال ترکہٗ کفر غیر الصلوٰۃ (ترمذی) یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیَامًا لِّلنَّاسِ "قیاماً للناس" پر غور کرو۔ چونکہ یہ مرکز ٹھیرا اس لیے تمام دائرے کا رخ بھی اسی طرف ہوا، خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں، لیکن ان کا منہ اسی طرف ہونا چاہیے: وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ (۲: ۱۴۵)۔

پھر جس طرح شخصی اور اعتقادی و عملی زندگی کے لیے مرکز قرار پائے، ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لیے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا، لہٰذا وہ مرکزی وجود بھی قرار دیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرے کے ٹھیرایا۔ اس کی معیت، اس کی رفاقت، اس کی اطاعت، اس کی حرکت پر حرکت، اسکے سکون پر سکون، اس کی طلب پر لبیک، اس کی دعوت پر انفاق جان و مال ہر مسلمان پر فرض کر دیا گیا۔ ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آ سکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام "خلیفہ" اور امام ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی کتاب و سنت کے مطابق اس کا حکم ہے، ہر مسلمان پر اس کی اطاعت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ	مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول کی اور
اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ	تم میں جو اولو الامر ہو اس کی۔ پھر اگر کسی معاملہ
فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی	میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے
اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ	رسول کی طرف لوٹو اور اس کے فیصلہ پر متفق ہو جاؤ

بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ، ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (۴: ۶۳)۔

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی، رسول کی، مسلمانوں میں جو اولوالامر ہو اس کی۔ اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے مقصود سنت قولی و فعلی ہے۔ باقی رہی اطاعت اولوالامر تو نہایت قوی و روشن وجوہ موجود ہیں کہ اولوالامر سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا، نظام امت قائم رکھنے والا اور تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے[1]

(حوالہ مذکور۔ صفحہ ۱۹ تا ۲۲)

اسلام کا نظام عمل | احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں؛ اور عہد صحابہ سے لے کر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شائد ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] مولانا نے اس باب میں جس چیز کو بیان فرمایا ہے وہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ فطرۃ اللہ اور سنت الٰہی ہے۔ ذاتی رائے ضرور بدل سکتی ہے، مگر سنت اللہ اور وہ فطرت جس پر اللہ نے نظام کائنات اور نظام اسلامی کی بنیاد رکھی ہے ایک محکم چیز ہے جس میں تبدیل و تحویل کسی طرح ممکن نہیں فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا

اس اٹل قانون کی رو سے امت مسلمہ کے لیے موت کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ ان میں لامرکزیت پیدا ہو اور اس نظام شمسی کے تمام تارے بکھر جائیں۔ اور آخری قدم یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام شمسی کے بجائے کسی اور نظام شمسی سے وابستہ ہو جائیں، کسی اور مرکز کے گرد گھومنے لگیں۔ پہلے مرحلہ میں ہندوستان کی امت مسلمہ اس وقت ہے، اور دوسرے مرحلے کی طرف اب اس کو بلایا جا رہا ہے جس کے انجام سے وہ لوگ ناواقف نہیں ہو سکتے جو اس قانون فطرت سے واقف ہیں، فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۔ ترجمان القرآن

قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اللهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ: اَلْجَمَاعَةُ وَالسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَالْهِجْرَةُ وَالْجِهَادُ فِیْ سَبِيْلِ اللهِ۔ فَاِنَّهٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ اِلَّا اَنْ يُّرَاجِعَ، وَمَنْ دَعَا بِدَعْوٰی جَاهِلِيَّةٍ فَهُوَ مِنْ جُثٰی جَهَنَّمَ۔ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ وَاِنْ صَامَ وَاِنْ صَلّٰی قَالَ وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ (اخرجه احمد والحاکم من حديث الحارث الاشعری علی شرط الصحيحين قال ابن کثير هذا حديث حسن وله شواهد)۔

یعنی فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جنکا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بیقیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

شرح حدیث حارث اشعری | اس حدیث میں پانچ باتیں تبلائی گئی ہیں۔

(۱) پہلی چیز "جماعت" ہے، یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ آگے چلکر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہو، اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے، انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی "جماعت" ہے۔

"جماعت" سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔

اتحاد سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمالِ حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں۔ کسی گوشۂ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

"ائتلاف" کا مرتبہ "اتحاد" سے بلند تر ہے۔ اتحاد صرف باہم مل جانا ہے۔ ضرور نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو۔ لیکن ائتلاف سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے وہی اس کی جگہ ہو........

"امتزاج" ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے...... فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک شئی ہے، اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے نہ مل جائے، کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا "امتزاج" کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو یہ نگینہ اسی انگشتری کے لئے تھا۔

"نظم" سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائرہ میں محدود، اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں، نہ قائم رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے۔ اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد، مؤتلف، ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک "امام" کا وجود ناگزیر ہوا، اور اسی لیے ضروری ہوا

کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام و مطاع تسلیم کرلیں جو بکھرے ہوئے اجزا کو اتحاد و ائتلاف اور امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے اور اڑتے ہوئے ذروں سے ایک حی و قائم جماعتی وجود پیدا کردینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ ..... مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لیے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں۔ حتّٰی کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں تو چاہیے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کرلیا جائے۔ اذا کان ثلثۃ فی سفر فلیومروا احدھم.....

(۲) دوسری چیز "السمع" ہے، یعنی امام جو احکام دے، اس کو سننا اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔ سمع کے لفظ میں قبولیت احکام اور طلب تعلیم دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

(۳) تیسری چیز "طاعت" ہے یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرمانبرداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کردینا اور اس کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا۔ البتہ اطاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں کہ انما الطاعۃ فی المعروف۔

(۴) چوتھی بات "ہجرت" ہے۔ ہجرت "ہجر" سے ہے جس کے معنی ترک کر دینے کے ہیں۔ الھجر والھجران مفارقۃ الانسان غیرہ اما بالبدن او باللسان او بالقلب۔ والمھاجرۃ مصارمۃ الغیر ومتارکتہ (مفردات امام راغب: ۵۵۸)۔ اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت، سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنے دنیوی محبوبات و مالوفات ترک کردے، مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، عزیز و اقرباء کے قرب کو، وطن و مکان کو، تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسول اور اس کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی۔ اِنِّی مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّی اور اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ .....

(۵) پانچویں چیز "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ جہاد "جہد" سے ہے جس کے معنی ہیں استفراغ الوسع

فی مدافعۃ العدو ظاہراً وباطناً (مفردات) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی ہوتی ہے، جان سے بھی ہوتی ہے۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو، ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ وجاھدوا المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم (رواہ ابوداؤد واحمد ونسائی وابن حبان عن انس)۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاء و قیام کی اصلی بنیادیں ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو۔ سعی وعمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں مل سکتی۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے، مگر کوئی چیز بھی بغیر "جماعت"، "اطاعت"، "ھجرت"، اور "جہاد" کے حاصل نہیں ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب انہی پانچ سچائیوں کے ثمرات ونتائج ہیں .... دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے، ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے، اور عامل جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے ان سے دنیا کو اختلاف ہے، لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی۔ اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز جماعت ہے جس کی مختصر تشریح اوپر گذر چکی۔ غور کرو! دنیا کا کونسا کام ایسا ہے جس کو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جا سکتا ہے۔ جماعت کی زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑ دو، صاف اور سیدھے سادے معنی جو ہو سکتے ہیں، صرف انہی پر غور کرلو۔ سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، بلکہ قوم، ملک، فوج، ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ

"جماعت" اور "التزام جماعت"۔ وحشی قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور مل جل کر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جماعت بے سود ہے اگر اس کا نظام نہ ہو اور کوئی سردار اور رہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو، تو سب سے پہلے ایک پریسیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لیں گے، یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے۔ اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر اپنے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں؟ ......

"ہجرت" کا لفظ کس قدر تمہارے لیے ناآشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا لیکن تبلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں وہ ہجرت کی حقیقت سے کب خالی ہیں؟ اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرۂ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے؟ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا، اور حصول مقصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں، ان سب کو ترک کر دینا۔ خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں حتّٰی کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں، سب کو چھوڑ دینا۔ پھر تبلاؤ، علم و عمل کا کون گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبہ کے مل سکتی ہے؟ انسان کے مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی تبلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گذرے اس نے پائی ہو؟ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز

ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت، فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو تو معلوم کر لوگے کہ صرف عمل ہجرت کے..... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبۂ نوع پرستی کی انتہا ہے لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ "ہجرت" سے تعبیر کرے تو تم اس کا انکار کر دو؟ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ "کشش ثقل" کا قانون دریافت کرے، تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے لیکن اگر تم عزم و طلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اس عازم صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کے لیے نہیں، بلکہ قانون نجات عالم کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے.......

جہاد کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی و محنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان، بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر "جہاد" کے زندہ و قائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء و قیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ "جہاد" سے تعبیر کیا ہے اگر تم سے ڈارون اور رسل ویلیس تنازع للبقاء (Struggle for Existence) اور

انتخاب طبعی Natural selection اور بقاء اصلح (Survival of the fittest) کا ذکر کرتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقا صرف اصلح و امثل کے لیے ہے، تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو، اور فطرت کے قتل کا افسانۂ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا لیکن اسی حقیقت کو قرآن و اسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ جو قانون الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں تک پر نافذ ہے، اس سے جمعیت بشری کیوں کر بری ہو سکتی ہے؟ پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانون الٰہی کا ہاتھ ان کو مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں لیظھرہٗ علی الدین کلہ۔ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانون ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارتگری کی دہشت ناکی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نوآبادیوں سے بھر دیں اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حقدار ہیں، اس کو تو تم گوارا کر لو، لیکن اگر اسلام کہے کہ اِنَّ الارض للہ و لرسولہ خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے، کفر و ضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے، تو تم اس کو وحشت اور خونفشانی کہو؟

جاہلیت کی زندگی اور اسلام کی زندگی یہاں ایک اور اہم اور قابل غور امر یہ ہے کہ اس حدیث اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے عکس کو جاہلیت۔ "جاہلیت" کی زندگی میں ہلاکت کا تخم کیا تھا؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم دگر علیحدگی، اور کسی مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہونا۔ اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو تخم ریزی کی وہ کیا تھی؟ باہمی اتحاد و ائتلاف۔ تمام منتشر افراد کو ایک متحدہ جماعت بنا کر نفس واحدہ کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکا دیے۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ

أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا۔

پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔

(حوالہ مذکور۔ صفحہ ۳۹ تا ۴۰)

مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل

مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے، یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

"جماعتی زندگی کی معصیت" سے مقصود یہ ہے کہ ان میں "ایک جماعت" بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں، کمیٹیاں بناتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت میں جماعت کا حکم نہیں رکھتیں بھیڑ اور انبوہ کا حکم رکھتی ہیں۔ "بھیڑ" اور "جماعت" میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آجاتی ہے، جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت، اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔ کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال وطاعات میں سرگرم ہوں لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں۔ اور قوم جماعتی

معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن و سنت نے تبلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے، لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے۔ مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے۔ . . . .

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا نہ کہ دانہ ڈالنے کا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی جد و جہد کی تمام گذشتہ زندگی گم گشتگی و بے حاصلی میں ضائع کر دی، حتیٰ کہ سچ مچ وہ وقت آگیا جس کی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا فَأَنَّىٰ لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرَاهُمْ (۴۷ : ۱۸)۔ اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا۔ سچے کام کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے مگر جب کبھی کیا جائے سچائی ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف۔ اس کے کرنے میں جس قدر دیر کی جائے گی، معصیت اور ہلاکی ہے لیکن جب کبھی کر دیا جائے سچائی اور نیکی ہے۔ اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی۔ . . . . تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے اور قوم و فرد دونوں اعتباروں سے اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے۔ اس ایک کام کے انجام پا جانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے۔ سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ایمان کی گم گشتگی کا ہے

(حوالہ مذکور ص ۲۰۶ تا ۲۰۹)

(مولانا نے ۱۰ سال پہلے مرض کی جو تشخیص فرمائی تھی، آج مریض کا حال بعینہٖ وہی ہے، یک سرمو فرق نہیں۔ پھر دین فطرت یا قانون فطرت کے مطابق اس کا صحیح علاج جو اُس وقت تجویز کیا گیا تھا، آج کوئی نئی صورت حال ایسی پیش نہیں آگئی ہے جس سے وہ علاج صحیح نہ رہا ہو یا کوئی علاج اس سے بہتر نکل آیا ہو۔ کرنے کا کام اس وقت بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ اجتماعی زندگی کی معصیت میں مبتلا رہ کر مسلمان جدھر بھی قدم اٹھائیں گے ہلاکت ہی کی طرف جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جب اس صحیح راہ عمل کی طرف دعوت دی گئی تھی اس وقت کسی نے اسے قبول نہ کیا، اور یہ بھی درست ہے کہ آج بھی کوئی اس کی طرف توجہ کرتا نظر نہیں آتا، مگر مقام دعوت و عزیمت (جس کی شرح و بیان کا حق مولانا نے اپنے "تذکرہ" میں ادا فرمایا ہے) یہ نہیں ہے کہ جب راہ حق کی طرف بلانے میں کامیابی نہ ہو تو راہِ باطل کی طرف دعوت دینا شروع کر دیا جائے، اور جب قوم بہشت کے راستے پر آنا قبول نہ کرے تو مایوس ہو کر اس کو جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے، بلکہ اس مقام بلند کا اقتضا ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ آخری سانس تک صحیح راستہ کی طرف دعوت دیتے رہو، اپنی پوری قوت اسی طرف قوم کو لانے میں صرف کر دو، تمام دنیا اگر منحرف ہو جائے، تب بھی اس راہ سے ہٹنے کا خیال تک نہ کرو، حتّٰی کہ اسی پر جان دیدو، اور اس میں ناکام و نامراد مرجانے کو غلط راستوں کی متاع غرور والی کامیابیوں پر ترجیح دو۔ ترجمان القرآن۔)

مطبوعات

تاریخ فلسفۂ اسلام | تالیف ٹ۔ ج۔ دو بوئر فرانسوی۔ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پروفیسر فلسفہ و تعلیمات جامعہ ملیہ اسلامیہ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

اس کتاب کو فلسفۂ اسلام کی "تاریخ" کسی معنی میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اسے تاریخ فلسفۂ اسلام پر ایک "تبصرہ" کہہ سکتے ہیں، اور علمی حیثیت سے لفظ "تبصرہ" جو وزن رکھتا ہے اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ کتاب اس معزز نام سے بھی موسوم ہونے کے لائق نہیں۔ پوری کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے فلاسفہ و متکلمین اسلام کی اصل کتابوں کو دیکھا ہی نہیں، یا اگر دیکھا بھی ہے تو بغیر کسی نظم و ترتیب کے ایک آدہ کتاب ادھر سے اور ایک آدہ ادھر سے سرسری طور پر دیکھ لی ہے جو ہرگز کسی سائنٹفک مطالعہ کے لیے کافی نہیں۔ اس کی معلومات تمام مستعار ہیں مختلف مغربی مصنفین نے فلسفۂ اسلام پر جو تبصرے لکھے ہیں، ان کو جمع کر کے اس نے اپنے ذہن میں ایک مرقع تیار کر لیا ہے اور اسی مرقع کو وہ ہمارے سامنے "تاریخ فلسفۂ اسلام" کے باوقعت نام سے پیش کرتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ایک سچے محقق کی طرح وہ اپنے ذہن کو غیر علمی مسلمات اور مشہور اوہام سے صاف کر کے، حقائق کو جیسے کہ وہ فی نفسہ ہیں، دیکھنے اور سمجھنے کے لیے مستعد نہیں کرتا، بلکہ جو عام غلط فہمیاں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اہل فرنگ میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو حقائق کی حیثیت سے قبول کر لیتا ہے اور انہی پر اپنے نظریات کی بنا رکھتا ہے۔ اس نے بغیر کسی تحقیق کے یہ فرض کر لیا ہے کہ اسلام چونکہ ایک امی قوم میں پیدا ہوا ہے، اور ایک اُمّی ہی نے اس کی بنا رکھی ہے (یہ لوگ محمد عربی صلعم کو اسلام کا "بانی" ہی سمجھتے ہیں) اس لیے "علم" سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔

کسی "علمی" بیداری یا کسی علمی تحریک کا اس کے لٹریچر اور اس کی تاریخ میں کھوج لگانا ہی عبث ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب مسلمانوں میں "علم" آئے گا ـــــ اور وہ بہرحال باہر ہی سے آئے گا ـــــ تو اس کی زد سے وہ اپنے آپ کو نہ بچا سکے گا۔ یہ مصنف کا ایک بڑا مفروضہ ہے جو اس کے تبصرے کی عمارت میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی کجی نے آخر تک پوری عمارت کو کج کر دیا ہے۔ ایک دوسرا مفروضہ جس کی حیثیت خشتِ ثانی کی ہے، یہ ہے کہ اہل مشرق فطری طور پر تنقید و تحقیق کی صلاحیت سے محروم ہیں، سائنٹفک اصول پر حقائق کا سراغ لگانا اور ان کو مرتب و مدون کرنا ان کی افتاد مزاج ہی کے خلاف ہے، اور اس باب میں "سامی ذہن" تو عام مشرقی ذہن کے مقابلہ میں بھی گیا گذرا ہے۔ ان دونوں مفروضات کی بنیاد پر "تاریخ فلسفہ اسلام" کی یہ پوری داستان جو مصنف نے بیان کی ہے، افکار اسلام کے نشو و ارتقاء کی ایک ایسی تصویر ناظرین کے سامنے پیش کرتی ہے جس کو دیکھ کر دو مختلف قسم کے آدمی دو مختلف قسم کے اثرات قبول کریں گے۔ جو شخص قبل اسلام اور دور اسلامی کی علمی تاریخ سے نابلد ہے وہ تو یہ سمجھے گا کہ علم کی شمع ہمیشہ "فرنگی دماغ" کی کار فرمائیوں سے روشن رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں یونانی دماغ نے اس کو روشن کیا، اور زمانہ جدید میں مغربی یورپ کی قوموں نے اس کو دیا سلائی دکھائی۔ بیچ کے دور میں اسلامی ذہن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے یونانیوں سے جو کچھ لیا اسے بھی پوری طرح نہ سمجھا، اور فلسفہ کے نام سے محض غلط فہمیوں کا ایک انبار جمع کر دیا۔ بخلاف اس کے جو شخص علم رکھتا ہے، جس کی نظر میں حکمائے متقدمین اور حکمائے اسلام دونوں کے کارنامے موجود ہیں، وہ اپنے آپ کو یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور پائے گا کہ مصنف جس موضوع پر کلام کر رہا ہے، اس سے بحث کرنے کا وہ ہرگز اہل نہیں، نہ علمی حیثیت سے اور نہ ذہنی حیثیت سے۔

اس مختصر تنقید میں اتنی گنجائش نہیں کہ مصنف کی غلطیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اس کی غلط فہمیوں اور دانستہ غلط بیانیوں کی توضیح کے لیے اتنی ہی بڑی ایک کتاب کی ضرورت ہے۔

مجملاً ہم صرف اتنا کہیں گے کہ جو شخص عربی علم نحو کی بنیاد کا سراغ یونانی اور عجمی علم اللسان میں تلاش کرتا ہو، جس کا خیال یہ ہو کہ قرآن کی صحت زبان ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں کو محاورے تراشنے کی ضرورت پیش آئی تھی، جس شخص کا مبلغ تحقیق یہ ہو کہ ابتدائی دور کے متکلمین نے "اختیار" کا عقیدہ مسیحی استادوں سے لیا تھا، جس شخص کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے مذاہب کلامیہ میں نظامیہ کے سوا کسی کا مذہب "طفرہ" کا قائل نہیں ہے، جو شخص سائنس کی پوری تاریخ سے آنکھیں بند کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہو کہ مسلمان سائنٹفک معلومات کے ذخیروں کو علمی طریقہ پر مدون و مرتب کرنا جانتے ہی نہ تھے، جو شخص ذکریا رازی کی تصانیف پڑھے بغیر یہ رائے زنی کرنے کی جرات کرتا ہو کہ اس نے ارسطو اور جالینوس کی کتابوں کو نہیں سمجھا، اور ساری عمر کیمیا گری میں گنوا دی، جو شخص ابن رشد پر یہ الزام لگاتا ہو کہ وہ اسلامی علم دین کو حقیر سمجھتا تھا، اور حقیقت اس کے نزدیک دبایں قرآن میں نہیں بلکہ ارسطو کی تصانیف میں تھی، ایسے شخص کو مشکل ہی سے اس کا اہل سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ "فلسفہ اسلام" جیسے اہم موضوع پر کلام کرسکے۔

حیرت یہ ہے کہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے مکتبہ سے یہ کتاب بغیر کسی تنقیدی مقدمہ اور بغیر کسی حاشیہ کے جوں کی توں شائع کر دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے علوم و فنون اور اپنی تاریخ کے متعلق ہمیں دوسروں کی "تحقیقات" یا بیانات سے بھی واقف ہونے کی ضرورت ہے، اور اس لحاظ سے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں، بلکہ فائدہ ہی کا پہلو رکھتا ہے۔ مگر جب کہ ہماری زبان میں فلسفۂ اسلام کی معلومات کا ذخیرہ بمنزلہ صفر ہے، اور اردو داں طبقے کے لیے ان ماخذ تک پہنچنا مشکل ہے جن کو دیکھے بغیر مغربی مصنفین کی غلط بیانیوں کا راز منکشف نہیں ہوسکتا، اس قسم کی کتاب کو بلا تنقید و تحشیہ شائع کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں نے ہماری جو غلط اور بھونڈی تصویر کھینچی ہے، اسے ہم خود اپنے ناواقف طالبان علم کے سامنے

پیش کریں اور انہیں یہ نہ بتائیں کہ تمہاری اصلی تصویر کیا ہے۔ اگرچہ فاضل مترجم نے اپنے دیباچہ میں بہت ذہنی زبان سے یہ تنبیہی فقرہ لکھدیا ہے کہ "یورپ کے مستشرقین کے لیے عربی غیر زبان ہے، اور وہ مشرقی خیال سے بیگانہ ہیں" اس لیے "اگر اس کتاب میں غلطیاں پائی جائیں تو جائے تعجب نہیں"، لیکن تریاق کی یہ ذرا سی چٹکی اس زہر کے مقابلہ میں کوئی اثر نہیں رکھتی جو اس کتاب کے مطالعہ سے، ناواقف اردو دان لوگوں میں پھیلیگا۔ فاضل مترجم کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "اصل میں یہ کام خود مسلمانوں کا ہے کہ اپنے تمدن کے متعلق خود اپنی قوم کے لیے اور ساری دنیا کے لیے صحیح معلومات بہم پہنچائیں"، مگر جب وہ جامعہ بھی اس کام کو انجام نہ دے جو مسلمانوں کو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، تو آخر ہم مسلمانوں کے اور کس طبقہ سے یہ امید رکھیں کہ وہ ہمارے تمدن کی صحیح نمائندگی کرے گا؟

ترجمہ کا نقش ثانی بلاشبہ نقش اول سے بہتر ہے۔ سات برس قبل جو ایڈیشن شائع ہوا تھا اس کے مقابلہ میں اب فاضل مترجم نے ترجمہ کو بہت زیادہ رواں، سلیس اور مفہوم بنا دیا ہے تاہم اتنی اصلاح کے بعد بھی ترجمہ کو پڑھتے وقت اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلامی فلسفہ کا بیان نہیں ہے مصنف اور مترجم دونوں اسلامی حکماء اور متکلمین کی اصل کتابوں پر نظر نہیں رکھتے، اس لیے ترجمہ در ترجمہ ہو کر ان کے خیالات کی صورت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ مترجم نے قدیم اصطلاحات کو چھوڑ کر نئی اصطلاحات وضع کی ہیں جن سے اجنبیت اور بڑھ گئی مثلاً (Categories) کے لیے قدیم اصطلاح "مقولات" ہے مترجم نے اس کو چھوڑ کر "ابواب" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ پرانی اصطلاح کے مقابلہ میں یہ نئی اصطلاح موزوں ہے یا نہیں علوم و فنون میں جو اصطلاحات رائج ہو چکی ہوں اور رواج کی قوت سے اپنے معانی موضوع لہا پر دلالت کرتی ہوں ان کو نئی اصطلاحات سے بدلنا بہرحال قابل اعتراض ہے۔

(Sense-Organ)) کا ترجمہ "الحاسّہ" درست نہیں۔ "عضو حاس" یا "آلہ احساس" یا صرف "حاس" کہنا چاہیے۔ (Substantial)) کے لیے قدیم اصطلاح "جوہری" ہے، اسے چھوڑ کر "جوہر آسا" کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ (activity)) کے لیے "فعالی" کی اصطلاح درست نہیں، فعل اور فعلیت اور فاعلیت کی اصطلاحیں پہلے سے رائج ہیں۔ (Predestina- tinoist) کے لیے "قدری" نہیں بلکہ "جبری" کی اصطلاح ہے۔ "قدری" اس کو کہتے ہیں جو انسان کے لیے "آزاد ارادہ" (free-will) کا قائل ہو۔ "متکثر" یا "متعدد" کے لیے مترجم نے "کثرت آسا" کی اصطلاح استعمال کی ہے جو بالکل غیر مانوس ہے۔ (Pheno- mena) کے لیے انہوں نے "مظاہر" کا لفظ پسند کیا ہے، مگر قدیم اصطلاح "آثار" ہے اور یہی لفظ قرآن میں بھی اس معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "نوری" یا "نورانی" کے لیے "نور آسا" "احاطہ کے معنی میں "احصار"، "علم الاحکام" یا "فقہ" کے لیے "علم الفرائض"، "آن" کے لیے "غیر ممتد لمحہ" کی اصطلاحیں بھی نامناسب ہیں اور ان میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

A New Muslim World In Making تالیف حافظ فضل الرحمن انصاری بی۔ اے علیگ۔ شائع کردہ آل ملایا مسلم مشنری سوسائٹی، سنگاپور۔

فاضل مصنف مسلمان قوم کے ان نوجوانوں میں سے ہیں جن سے بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ابھی ان کا زمانہ طالب علمی ختم بھی نہیں ہوا ہے اور ابھی سے انہوں نے قابل قدر علمی خدمات انجام دینی شروع کردی ہیں۔ اپنی اس تازہ تصنیف میں وہ عہد جدید کی تاریخ کا بالکل ایک نیا باب پیش کرتے ہیں جس کو آرنلڈ کی (Preaching of Islam)) کا بہترین ضمیمہ کہا جاسکتا ہے۔ زمانہ حال میں اسلام اپنے پیروؤں کی مادی اور روحانی کمزوریوں کے باوجود جس طرح ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ، اور کرۂ زمین کے بعید ترین جزائر میں پھیلا ہے اور پھیلتا جارہا ہے اس کی ایک مکمل تصویر آپ

اس کتاب میں نظر آئے گی۔ آپ اس میں دیکھیں گے کہ معمولی علم و عقل والے نہیں، بلکہ سلطنتوں کے سفراء، علوم جدیدہ کے ماہرین، اعلیٰ درجے کے مصنفین اور اخبار نویس، حتیٰ کہ غیر مذاہب کے پیشوا اور مبلغین بھی جب اسلام سے روشناس ہوئے اور اس کی اصلی صورت ان کو نظر آگئی تو کس طرح وہ اس کے شیدائی ہوگئے، اور کس طرح انہوں نے اپنی زندگیوں کو اس دین کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ اس قسم کی ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں مثالیں مصنف نے بیان کی ہیں اور ایک ایک ملک کو لے کر بتایا ہے کہ اسلام کی فتوحات کا دائرہ محض اپنی روحانی قوت سے کس طرح وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصنف نے تفصیل کے ساتھ جماعت احمدیہ کی تبلیغی کارروائیوں پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا ہے۔

مسلمان اور سائنس تالیف خان بہادر محمد ذکاء اللہ خان صاحب۔ ایم۔ اے۔ ریٹائرڈ کلکٹر و نائب ریاست دتیا قیمت ۴ ر ملنے کا پتہ لطیفی پریس، دہلی۔

یہ کتاب اس سے پہلے مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوچکی ہے۔ مگر وہ اشاعت ناقص تھی۔ اب مؤلف نے بہتر کتابت و طباعت کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کرا دیا ہے۔

فاضل مصنف ایک دردمند اور مخلص مسلمان ہیں۔ انہوں نے یہ رسالہ اس مقصد کے لیے لکھا ہے کہ علمائے کرام کو قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح، اور علوم جدیدہ، خصوصاً سائنس، کی تعلیم کی طرف توجہ دلائیں۔ یہ مقصد بجائے خود صحیح ہے، اور ضرورت ہے کہ عربی مدارس کے ارباب حل و عقد اس رسالہ کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کریں۔ لیکن ہمیں مصنف کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ علماء نفس علوم جدیدہ کے مخالف ہیں، اور ان علوم کو دہریت و الحاد پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مصنف کو غالباً معلوم ہوگا کہ علماء ہند کے سرخیل حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اس زمانہ میں مسلمانوں کو علوم جدیدہ کی طرف توجہ دلائی تھی جب سر سید احمد خان شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے

اور ہندوستان میں کسی شخص کو اس ضرورت کا احساس نہ تھا۔ شاہ صاحب کی دوررس نگاہوں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان پر ایک حکیم قوم مسلط ہو رہی ہے اور حکیم کا مقابلہ حکمت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے غدر سے پہلے دہلی کالج میں جب علوم جدیدہ کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی تھی تو علماء میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کو حکمت کی تعلیم سے کبھی اختلاف نہ تھا نہ آج ہے۔ اصل چیز جس کے وہ مخالف تھے اور آج بھی مخالفت پر مجبور ہیں، وہ طرز تعلیم ہے جو انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے لیے رائج کیا ہے ابتداً جدید تعلیم تمام تر عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تھی، اور سرکار برطانیہ کی سرپرستی میں انہوں نے بیسیوں زنانہ و مردانہ تعلیمگاہیں صرف اس غرض کے لیے جاری کی تھیں کہ اگر ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی نہ بنایا جا سکے، تو کم از کم اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے بیگانہ بنا دیا جائے، اور ان کے دلوں میں فرنگی تہذیب کی عظمت اور فرنگی اقتدار کی غلامی کا گہرا نقش بٹھا دیا جائے۔ اس کے بعد جب خود حکومت نے تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو جدید تعلیمی پالیسی کا سنگ بنیاد میکالے کے اس تخیل پر رکھا گیا کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی "جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی، مگر مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے انگریز ہوگی"۔ اس پالیسی کے تحت جتنے مدارس اور کالج قائم ہوئے ان کا اصل مقصد باشندگان ہند کو زیور علم سے آراستہ کرنا نہ تھا بلکہ ان کے دل و دماغ کو انگریزی اقتدار کی غلامی کے لیے تیار کرنا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ ان تعلیمگاہوں میں مسلمانوں کے خلاف تو ایسی سخت زہریلی فضا پیدا کی گئی تھی کہ کوئی خوددار مسلمان اس میں سانس نہ لے سکتا تھا۔ ان کے اسلاف پر تبرا بھیجا جاتا تھا۔ ان کے مذہب کی توہین کی جاتی تھی۔ ان کے عقائد کی تردید ہوتی تھی۔ ان کی تہذیب کا مذاق اڑایا جاتا تھا؛ اور اس کے ساتھ ہر ممکن ذریعہ سے کوشش کی جاتی تھی کہ اسلامی علوم و فنون دنیا سے مٹ جائیں، عربی و فارسی کی تعلیم بند ہو، اور اسلامی علوم پڑھنے والوں

کے لیے رزق کے دروازے مسدود ہو جائیں۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ علماء اس تعلیمی پالیسی کی مخالفت کرنے میں حق بجانب نہ تھے؟

انیسویں صدی کے آخر میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے جو تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھی اس کے دنیوی اور مادی فوائد سے کسی کو انکار نہیں، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو طرز تعلیم علیگڑھ اور دوسری اسلامی درسگاہوں میں اختیار کیا گیا وہ ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ اسی طرز تعلیم کا چربہ تھا جو انگریزی حکومت نے رائج کیا تھا۔ اس کی مخالفت علماء نے اس بنا پر کبھی نہیں کی کہ انگریزی زبان کیوں پڑھائی جاتی ہے، یا علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے۔ بلکہ مخالفت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس میں انگریزی زبان کے ساتھ فرنگی ذہنیت بھی بطور جزو لازم کے شریک کی گئی اور علوم جدیدہ کی تعلیم میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا جو انگریزی حکومت کی رائج کردہ تعلیم میں اساس و اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاضل مصنف کی طرح ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ علوم جدیدہ میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں جو اسلام کا مخالف ہو۔ طبیعیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم، حتیٰ کہ فلسفہ میں بھی کوئی ثابت شدہ حقیقت ایسی نہیں ہے جو اسلام کے اصول و فروع میں سے کسی کی تردید کرتی ہو، بلکہ اس کے برعکس یہ سب علوم دراصل مسلمان کے ایمان میں اضافہ کرنے والے اور اسکو خلافت الٰہی کے فرائض کی بجا آوری میں مدد دینے والے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جدید درسگاہوں میں ——— خواہ وہ قومی ہوں یا سرکاری ——— ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹۵ فی صدی مسلمان طلبہ کی مت کیوں پلٹ جاتی ہے؟ وہ ہندوستانی مسلمان سے یکایک "صاحب بہادر" کیوں بن جاتے ہیں؟ ان کی لڑکیاں خاتون مشرق سے یکلخت "میم صاحب" کیوں بن جاتی ہیں؟ ان کی زبان، ان کے لباس، ان کی معاشرت، ان کے عادات و اطوار پر فرنگیت کیوں مسلط ہو جاتی ہے؟ ان کے دماغ اپنے دین کی صداقت میں کیوں شک کرنے لگتے ہیں؟ ان کے

اندر حدودِ شریعت سے آزادی کا مرض کیوں پیدا ہو جاتا ہے؟ وہ نماز سے کیوں گریزاں ہوتے ہیں؟ رمضان میں علانیہ کھانے پینے اور سگریٹ کے دھویں اڑانے کی جرأت ان میں کیوں پیدا ہوتی ہے؟ شعائرِ اسلامی کا مذاق اڑانے اور عقائدِ اسلامی کے خلاف زبان کھولنے پر وہ کیوں جری ہو جاتے ہیں؟ آخر وہ کونسی چیز ہے جو طبیعیات اور فلسفہ کے طالب علم کو دہریہ بناتی ہے؟ عمرانیات کے طالب علم کو اسلام سے ہٹا کر سرمایہ داری یا اشتراکیت کی طرف لے جاتی ہے؟ تاریخ و سیاسیات کے طالب علم کو رنگ و نسل و وطن کی پرستش کا سبق سکھاتی ہے؟ قانون کے طالب علم کو اسلامی قوانین میں جاہلانہ ترمیمیں کرنے پر آمادہ کرتی ہے؟ اور مشترک طور پر تمام علومِ جدیدہ کے طالب علموں میں یہ مرض تھوڑا یا بہت پیدا کر دیتی ہے کہ ان پر زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر غالب ہو جاتا ہے اور وہ ہر چیز کی قدر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کے لحاظ سے متعین کرنے لگتے ہیں؟ اگر آپ حکیمانہ نظر سے ان خرابیوں کے اسباب کا تجسس کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ محض سطح کا میل کچیل نہیں ہے جو اوپر سے مسلمان نوجوانوں کو لگ جاتا ہو بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ اس غلط طرزِ تعلیم اور ناقص طریقِ تربیت میں نشو و نما پا رہی ہیں جو علومِ جدیدہ کی تعلیم کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور جس میں اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ علماء اگر اس کی مخالفت کرتے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کرتے، بلکہ وہ اسلام کے دشمن ہوں گے اگر اس کی حمایت کریں گے۔

پس درحقیقت علماء پر اس حیثیت سے کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ علومِ جدیدہ کی تعلیم کے موجودہ طرز کے مخالف ہیں، بلکہ ان پر الزام ایک دوسری حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ وہ اس بنا پر ملزم اور سخت ملزم ہیں کہ زمانہ کی ضروریات کو سمجھنے اور قدیم طرزِ تعلیم کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے اردگرد ساتویں صدی ہجری کی فضا طاری کر رکھی ہے جس میں العالم متغیر و کل متغیر حادث کا سبق تو روز دیا جاتا ہے مگر اس کی حقیقت

تسلیم کرنے سے ہر آن انکار کیا جاتا ہے۔ وہ آج تک ان فرق باطلہ کا رد دیکھے جا رہے ہیں جو اب دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں، اور آج جو نئی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو سمجھنے تک کی اہلیت اپنے اندر پیدا نہیں کرتے، کجا کہ ان کا رد کر سکیں۔ ان کی زبان پرانی، ان کے خیالات پرانے، ان کی حجتیں پرانی، ان کی حرکات و سکنات پرانی، غرض مجموعی حیثیت سے وہ خود اس قدر پرانے ہیں کہ دنیا آج ان کو آثار قدیمہ میں شمار کرنے پر مجبور ہے۔ جدید زمانے کی زندگی میں وہ اس کے سوا کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتے کہ لوگ ان کو اسلام کا نمائندہ سمجھ کر خود اسلام سے بدگمان ہو جائیں۔ ان میں اتنک ایسے لوگ موجود ہیں جو اخبار تک پڑھنا پسند نہیں کرتے کہ مبادا العالم متغیر کی حقیقت ان پر منکشف نہ ہو جائے۔ فاضل مصنف تو ان پر صرف علوم جدیدہ سے ناواقفیت کا الزام لگاتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ خود اسلامی علوم کی تعلیم بھی جو ان کے مدرسوں میں دی جا رہی ہے، شدت کے ساتھ محتاج اصلاح ہے۔ درحقیقت وہ اس قدر ناقص ہے کہ اس کے انتہائی مدارج پر پہنچ کر بھی انسان روح اسلامی سے بیگانہ رہتا ہے، اور اس میں اسلام کو سمجھنے تک کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی، کجا کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کی نمائندگی کر سکے۔ اس طرز تعلیم کے نقائص بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ ایک مستقل مضمون عربی مدارس کی تعلیم پر بھی اسی طرح لکھا جائے گا جس طرح علیگڈھ یونیورسٹی کی تعلیم پر لکھا جا چکا ہے۔

خاتمہ تالیف حضرت سید محمد گیسو دراز چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم۔ اے۔ سی، ای، بنگم پلی۔ حیدرآباد دکن۔

"آداب المریدین" تصوف کی مشہور کتابوں میں سے ہے۔ حضرت خواجہ گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تین شرحیں لکھی تھیں، اور ان میں سے ایک شرح کے آخر میں تکملہ یا ضمیمہ کے طور پر یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا جس کا نام "خاتمہ" ہے۔ اس میں حضرت نے تفصیل کے ساتھ وہ ہدایتیں درج فرمائی

ہیں جنھیں ایک طالب حق کو تعلیم سلوک کے دوران میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مدتوں سے یہ رسالہ گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ مولوی سید عطا حسین صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسے جدید طرز پر اڈٹ کر کے شائع کر دیا۔

تصوف جس علم اور جس عمل کا نام ہے اس کی صحیح تصویر اگر آپ کو دیکھنی ہو تو ان اکابر اولیاء اللہ کی تصانیف دیکھیے جو اس علم و عمل کے حقیقی نمائندے ہیں۔

عورت تالیف جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب زائد سشن جج گلبرگہ۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات قیمت (عہ) ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن۔

جدید مغربی تہذیب میں عورت اور مرد کا فطری توازن بگڑ جانے کی وجہ سے تمدن و معاشرت میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو فاضل مؤلف نے ایک حد تک تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے پوری کتاب عدالتی مقدمات اور معتبر کتابوں اور رسالوں کے شواہد سے بھری ہوئی ہے۔ خود مؤلف یورپ کی سیاحت کر چکے ہیں اور انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات بھی بیان کیے ہیں۔ جو لوگ صنفی معاملات میں یورپ کی اندھی تقلید پر مائل ہیں انھیں خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ افسوس کہ اس کتاب کی ترتیب زیادہ اچھی نہیں ہے، مؤلف نے مختلف عنوانات کے تحت واقعات کو محض جمع کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ واقعات کے درمیان کوئی فلسفیانہ ربط پیدا نہیں کیا جس سے ذہن آسانی کے ساتھ نتائج اخذ کر سکے۔ تاہم واقعات بہت سبق آموز ہیں، اور ان کو پڑھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ یہ مغربی تہذیب انسان کو کدھر لے جا رہی ہے۔

فصل الخطاب تالیف جناب اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت مجلد (عہ) غیر مجلد ۱۲ر ملنے کا پتہ: منیجر مکتبہ عبرت، نجیب آباد (یوپی)۔

آج کل پنجاب میں دو مختلف سمتوں سے اسلامی امارت کا ایک ہی نظریہ پیش کیا جا رہا ہے جو سراسر غیر

ہے، مگر مسلمانوں کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے اس کو اسلامی لباس پہنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں امیر کی حیثیت "مُطاعِ مطلق" کی ہے۔ جس طرح نبی قوم کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اسی طرح نبی کا نائب بھی جواب دہی سے مبرّا ہے۔ اور اس کے کسی حکم اور کسی قول و فعل پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ قوم کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، بے چون و چرا اطاعت، ویسی ہی اطاعت جیسی نبی کی کرنی چاہیے۔ اس نظریہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرآن مجید کی وہ آیت ہے جس میں اطاعت اولی الامر کا حکم دینے کے ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو جائے تو اس کو خدا اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو)۔ اس آیت کا صاف منشا یہ ہے کہ حق اور باطل کی تمیز کے لیے مسلمانوں کے پاس اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک معیار ہے، اور یہ معیار اس قوم کو اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ اپنے جیسے انسانوں کو اربابٌ من دون اللہ نہ بنائے، شخصیت پرستی میں مبتلا نہ ہو، کسی بڑے سے بڑے آدمی کی بھی اندھی تقلید اور کورانہ اطاعت نہ کرے، بلکہ ہر رہنما کی رہنمائی اور ہر حاکم کے حکم کو اس معیار پر جانچ کر دیکھتی رہے کہ آیا وہ حق کی طرف لے جا رہا ہے یا باطل کی طرف۔ مگر عبداللہ ابن سبا کے زمانہ سے آج تک تمام گمراہ فرقوں اور ضلالت کے داعیوں کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی معیارِ حق پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، کیونکہ اس کی موجودگی میں ان کا کاروبار کسی طرح چل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا جاتا ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کا طریقہ، جو مسلمانوں کے سامنے اسلامی زندگی کا حقیقی نمونہ ہے، یک قلم محو ہو جائے۔ اس کے بعد قرآن کی غلط تاویلات کی جاتی ہیں اور ایسے خوشنما طریقوں سے کی جاتی ہیں کہ ہر وہ مسلمان دھوکا کھا جائے

جو بچارا خود قرآن کا صحیح علم نہیں رکھتا پھر یہ خطرہ پیش آتا ہے کہ کہیں صحیح علم رکھنے والے اس فریب کا پردہ چاک نہ کر دیں۔ تو اس کا سد باب کرنے کے لیے علماء پر گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی ہے تاکہ قوم کی نگاہ میں ان لوگوں کو ساقط الاعتبار کر دیا جائے جو اس کو حقیقت سے خبردار کر سکتے ہوں، اور اس طرح قوم کے ناواقف لوگ آسانی کے ساتھ اس شخص کی مٹھی میں آجائیں جو ان پر اپنی شب کشیدہ کا جال پھیلانا چاہتا ہو۔ مزید براں ایک چال یہ بھی اختیار کی گئی ہے کہ جو لوگ اس غلط رہنمائی پر تنقید کرتے ہیں ان کے جواب میں نہایت غیر مہذب اور غیر شریفانہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے تاکہ کوئی شریف آدمی جس بازار اپنی پگڑی اچھلوانا پسند نہ کرتا ہو ان گمراہ کن لوگوں کی کارروائیوں پر نکتہ چینی کی جرأت نہ کر سکے اور خاموشی کے ساتھ اپنی قوم کو ایک غلط راستہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس قوم کا کیا حشر ہوگا جس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ خود اپنی قوم کی جہالت اور مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں مسلمان قوم کے کم از کم ۹۵ فی صدی افراد قرآن و سنت کے صحیح علم سے بے بہرہ ہیں۔ یہ چیز ان لوگوں کے لیے ایک سرمایہ بن گئی ہے جو اس غریب قوم کے سروں پر اپنی کبریائی کا قصر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کا دوسرا سرمایہ اس قوم کی وہ مصیبت ہے جس میں یہ آج کل مبتلا ہے۔ بدنظمی و انتشار کے ہولناک نتائج نے ساری قوم کو ہراساں کر دیا ہے وہ تنظیم کی پیاسی ہو رہی ہے، اور اس پیاس نے اس کو اتنا بدحواس کر دیا ہے کہ تنظیم کا لیبل لگا کر زہر کا پیالہ بھی اگر اس کو دیا جائے تو دوڑ کر منہ سے لگا لے گی۔ یہ دوسری چیز ہے جس سے خود غرض لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ (یعنی قادیانی) تو پہلے ہی ایک فرقہ بن چکا ہے جس کے زہریلے اثرات کو آج ہر صاحب عقل مسلمان محسوس کر رہا ہے۔ اب دوسرا گروہ (یعنی خاکسار) اپنے اندر روز بروز وہ تمام

خصوصیات پیدا کرتا جا رہا ہے جو بالآخر اس کو بھی ایک فرقہ اور جنگ جو فرقہ بنا کر چھوڑیں گی۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے امارت کے ان دونوں قادیانی و خاکساری نظریوں کی تردید میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ و طریقۂ خلفاء راشدین سے بہترین دلائل مہیا کیے ہیں۔ ان کے جواب میں مخالفین کے پاس کوئی وزنی دلیل نہیں ہے اس لیے انہی اوچھے ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے جو باطل کے حامیوں کا آخری سہارا ہیں۔ وہ بجز اس کے کوئی جوابی دلیل —— اگر اس کو دلیل کے بوقعت نام سے یاد کیا جا سکتا ہے پیش نہ کر سکے کہ اکبر شاہ کی تحریر میں "ملائیت" ہے اور "ان کا بڑا منشا کتابیں لکھنے سے کتابوں کی فروخت ہے"۔ مقصد یہ ہے کہ لوگ اُس کتاب کی طرف سے پہلے ہی بدگمان ہو جائیں جو ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر سکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم امید رکھتے ہیں کہ خاکسار تحریک میں جو نیک نیت مخلص اور حقیقی اسلامی جذبہ رکھنے والے لوگ محض اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا داعیہ لیکر شریک ہوئے ہیں، وہ تعصبات سے خالی الذہن ہو کر مولنا اکبر شاہ خاں کی اس کتاب کو دیکھیں گے، اور اس غیر اسلامی امارت کے وقتی فوائد سے قطع نظر کر کے اس کے دوررس نتائج و عواقب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

تبصرہ بر تذکرہ نمبر ۱ و ۲ | یہ دو رسالے ہیں جن میں عنایت اللہ خان صاحب مشرقی کی کتاب "تذکرہ" پر چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔ اے اور مولنا سید سلیمان ندوی کے تبصرے نقل کیے گئے ہیں۔ دونوں مضمون غایت درجہ سنجیدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور ان میں "تذکرہ" کی اساسی غلطیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ناشر نے مشرقی صاحب کے خلاف درشت کلامی اختیار کر کے ان تبصروں کی وقعت میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کو اور گھٹا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ خود مشرقی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات بھی درشت کلامی میں کسی سے

پیچھے نہیں ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ درشتی کا جواب درشتی سے دیا جائے جو لوگ درحقیقت مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھانا چاہتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ نہایت متین لہجہ اختیار کریں، تاکہ مسلمان ٹھنڈے دل سے تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر رائے قائم کرسکیں۔

دونوں رسالے ۳ کے ٹکٹ بھیج کر مہتمم دائرۃ الارشاد، چوک بابا اٹل امرت سر سے منگائے جاسکتے ہیں۔

اسلام اور مرزائیت | تالیف مولوی عتیق الرحمٰن صاحب آروی۔ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۳ ملنے کا پتہ: مولوی عتیق احمد صاحب صدیقی مدیر قاسم العلوم۔ دیوبند۔

اس مختصر رسالہ میں مؤلف نے ایک طرف اسلام کے اصلی عقائد قرآن وحدیث سے جمع کئے ہیں۔ اور دوسری طرف قادیانی عقائد خود مرزا صاحب اور ان کے خلیفہ اور اکابر طائفہ کی تحریروں سے فراہم کردیے ہیں، تاکہ دونوں کا تقابل کرکے ہر طالب حق خود فیصلہ کرے کہ اسلام اور قادیانیت میں اصولاً کتنا بڑا فرق ہے، اور قادیانیت کو اسلام کا ایک فرقہ سمجھنا کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے۔

سرکار کا دربار | تالیف مولوی الیاس احمد صاحب مجیبی۔ ضخامت ۲۸ صفحات۔ قیمت ۸ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ جامعہ دہلی۔

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بہت سہل اور میٹھی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، اور ایسا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے بچوں کے دل پر سرکار اور یاران سرکار کی عظمت کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر مسلمان بچے کو پڑھائی جائے۔

نبوت اور نبی | یہ وہ خطبہ ہے جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب استاد فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علیگڈہ نے یوم النبی کی تقریب پر یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات کے سامنے پڑھا تھا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ ہماری یونیورسٹی میں جو شخص فلسفہ کا پروفیسر ہے وہ ایک سچا اور صحیح العقیدہ مسلمان ہے، اور اپنے علم کو دہریت والحاد کے بجائے ایمان باللہ وایمان بالرسول کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔ فاضل خطیب نے اس مختصر سے خطبہ میں

دراصل دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ دیکھنے والے کے لیے الفاظ بہت کم ہیں مگر سمجھنے والے کے لیے معانی بہت زیادہ ہیں۔ ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے قلب کو ابتدا سے آج تک جس چیز نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مضطرب کیے رکھا ہے وہ اپنے کمالِ لائق کو پہنچنے کی خواہش ہے۔ سائنس فلسفہ اور شہود باطنی (Religious experience) کے ذریعہ سے انسان نے اپنے اس مطلوب تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام ہوا۔ ان تینوں ذرائع کی ناکامی آج ہر صحیح النظر نقاد پر روشن ہے۔ اب صرف ایک ہی ذریعہ جادۂ کمال کی دریافت کا باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وجود کامل خود اس وجود ناقص یعنی انسان کی طرف متوجہ ہو اور اس کو اپنی طرف آنے کا راستہ بتائے۔ یہی چیز ہے جس کو نبوت کہتے ہیں، اور درحقیقت راہ راست پانے کا کوئی ذریعہ نبی پر ایمان لانے اور اس کی پیروی کرنے کے سوا نہیں ہے۔

آگے چل کر خطیب فاضل نے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی و نبوت کے کامل ترین مظہر ہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی سیرت، آپ کی نبوت پر ایسی قطعی شہادت ہے کہ عقل سلیم کے لیے کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد وہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں کہ مذہب کو ایک انفرادی چیز سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ وہ محض انسان اور خدا کے درمیان ایک تعلق ہے، کس قدر غلط اور گمراہ کن تخیل ہے۔ ہدایت دراصل ہدایت ہی نہیں ہے اگر وہ انسان اور انسان کے تعلق کو درست کرنے کے لیے کوئی رہنمائی نہ پیش کرے۔

ہم اپنے ناظرین سے اس خطبہ کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں مجلس اسلامیات علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے غالباً مفت مل سکیگا۔

بصائر القرآن: جناب نکہت شاہجہانپوری۔ بی۔ اے۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت ۸/ مولف سے انجمن اسلامیہ ہائی اسکول بوری بندر بمبئی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

یہ مختصر کتاب ان خطبات کا مجموعہ ہے جو جناب نکہت نے انجمن تحریک قرآنی کے جلسوں میں قرآن مجید

کی تعلیمات پر ارشاد فرمائے تھے۔ فاضل خطیب نے عقیدۂ توحید، مغفرت الٰہی، رحمت الٰہی، اور مبادئ اسلام کے عنوانات پر کلام کیا ہے اور ان کے تحت مسلمانوں کی بہت سی عام غلط فہمیوں کو دور کر کے اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح کی ہے جو موجودہ زمانہ کے روشن خیالوں کو اپیل کرتی ہے۔ بعض بعض مقامات پر خطیب سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں، مثلاً وہ اللہ تعالیٰ کی صفت غفاری کو "جذبہ" سے تعبیر کرتے ہیں، اور شفاعت کو "خدا کے جذبۂ غفران سے اپیل" قرار دیتے ہیں۔ لفظ "جذبہ" جن معنوں میں عام طور پر مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے حق تعالیٰ کی طرف اسے منسوب کرنا درست نہیں۔ اس کے بجائے "صفت" کی پرانی اصطلاح ہی کو استعمال کیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا؟

آخری رسول | تالیف جناب ماہر القادری صاحب ضخامت ۴۰ صفحات قیمت ۸ / ملنے کا پتہ: مکتبۂ علمیہ، چار مینار حیدرآباد دکن۔

جناب ماہر نے اس کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بہت سادہ اور عام فہم زبان میں لکھی ہے مقصد یہ ہے کہ مولود کی بے اصل کتابوں کے بجائے اس قسم کی کتابوں کو رواج دیا جائے جن میں سیرت پاک کے صحیح حالات ہوں اور ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیمات پر بھی کچھ روشنی پڑتی جائے۔ کتاب بلاشبہ اس مقصد کیلئے مفید ہے، مگر بہتر ہوتا کہ عام مذاق کی رعایت ملحوظ رکھ کر بیان کو زیادہ رنگین اور خطیبانہ کر دیا جاتا، اور بیچ بیچ میں نعتیہ اشعار بھی لائے جاتے۔ جناب ماہر یہ دونوں کام خوبی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ خصوصاً نعت کے باب میں عام مذاق جس قدر پست ہو گیا ہے اس کو بلند کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ماہر جیسے قادر الکلام شاعر صحیح قسم کی نعتیں کہیں اور ان کو عام رواج دیا جائے۔

بعض مقامات پر مصنف نے جوش عقیدت میں نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے، مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جگہ جگہ شہنشاہ لکھا ہے، حالانکہ حضور نے خود اس لفظ کو غیر اللہ کے لیے استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ حضور کا چہرہ سورج سے زیادہ چمکیلا تھا اور آپ کے پسینہ میں مشک و عنبر سے زیادہ خوشبو تھی۔ یہ محض ایک عقیدتمندانہ مبالغہ ہے، اور سرکار رسالتمآب کے محاسن و فضائل اس سے بالا و برتر ہیں کہ آپ کی فضیلت بیان کرنے کے لیے اس قسم کے مبالغوں کی ضرورت ہو۔ ترتیب واقعات میں بھی کچھ فروگذاشتیں رہ گئی ہیں، مثلاً بادشاہوں کے نام آپ کے دعوت ناموں کا ذکر فتح مکہ کے بعد کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔

تمدن عرب مصنفہ ڈاکٹر گستاؤلی بان ترجمہ علامہ سید علی بلگرامی مرحوم اور آنریبل نواب جیون یار جنگ بہادر جیب حسن عمد العالیہ کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ دوسری بار شائع ہوئی ہے قیمت (للعہ) روپیہ علاوہ خرچ ڈپہ۔

تمدن ہند مصنفہ ڈاکٹر گستاؤلی بان ترجمہ علامہ سید علی بلگرامی مرحوم کے بے مثل کارنامہ جس کے اسوقت چند نسخہ باقی رہ گئے ہیں (امید کہ علم دوست حضرات اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے) قیمت صرف (للعہ) روپیہ علاوہ خرچ ڈپہ۔

ابن سعود مؤلفہ مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ عثمانیہ سلطان ابن سعود کی زندگی کے واقعات کا ایک دلکش اور حیران کن مرقع جس نے عرب کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک کر از سر نو میدان عمل میں لا کھڑا کیا اس کتاب سے سلطان کی کارگزاریوں اور عرب کے موجودہ حالات کا پتہ چلتا ہے قیمت مجلد (عہ)

مسز حسین مؤلفہ مولوی فیض محمد صاحب و سید بادشاہ حسین صاحب عہد حاضرہ کی مشہور ترین عورت جس کے حالات زندگی سے ہر فرد بشر واقف ہونے کے لیے بے چین ہے۔ باوثوق ذرائع سے مہیا کر کے اس رومانوی داستان کو مورخانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے قیمت (عمہ) خرچ ڈپہ بذمہ خریدار۔

مشاہیر ہند۔ مؤلفہ سید بادشاہ حسین صاحب۔ ہندوستان کے چھ مشاہیر آغا خان، اقبال، اکبر حیدری، ٹیگور، اور جواہر لال کے سبق آموز سوانح حیات انکے علمی و ادبی کارناموں پر تبصرے انکی قوم پرستی کے کارنامے اور ان کے شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں ٹائیٹل کے دیدہ زیبی کے علاوہ مشاہیر کی عمدہ تصویریں بھی شامل ہیں قیمت مجلد (عمہ)

اردو میں ڈرامانگاری مصنفہ سید بادشاہ حسین صاحب فن ڈرامانگاری پر ایک مبسوط تبصرہ ڈراما کی تاریخ اس کی تدریجی ترقی کے اسباب و علل اور ان کا تفصیلی خاکہ اردو ڈراما کی ابتدا اسکی نشو و نما۔ ممتاز ڈراما نگاروں کی فنی صلاحیت پر تنقید ان کے مشہور ڈراموں پر الگ تبصرہ شامل ہے اس موضوع پر یہ پہلی مکمل کتاب ہے جس کے متعلق متعدد معیاری رسائل و اخبارات میں تنقیدیں شائع ہو چکی ہیں صفحات تقریباً ۳۰۰ مجلد قیمت (عہ)

اور حسب ذیل کتب عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہونگے شائقین اور علم دوست حضرات انتظار کریں۔

مصطفیٰ کمال پاشاہ اتاترک، رضا شاہ پہلوی، ہر ہٹلر، سنیر مسولینی، ڈیوک آف ونڈسر اڈورڈ ہشتم

کتب خانہ ہذا میں

علاوہ درسی کتب کے ہر قسم کے علمی و ادبی کتب بھی موجود ہیں اور آرڈروں پر فراہم کیے جاسکتے ہیں۔

سید عبدالقادر اینڈ سنس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پبلشرز چارمینار حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس